ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۱۵

دوسرا سال: تیسری کتاب

مارچ ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey@poetic.com
مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ باغ و بہار کی اُسلوبیاتی ساخت — ڈاکٹر مرزا حامد بیگ — ۴
۳۔ راشد کی نظم ''تصوف'' پر ایک نظر — شوکت نعیم قادری — ۱۱
۴۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۵) — ابنِ حسن — ۱۹

انتخاب: نجم الاصغر شاہیا

۵۔ تعارف و انتخاب (غزلیں اور نظمیں) — نجم الاصغر شاہیا — ۳۱

نوبل لیکچر ۲۰۰۳ء:

۶۔ وہ اور اُس کا ہم زاد — جے۔ایم۔کوئٹزی/شگفتہ حسین — ۵۵

کہانی:

۷۔ جب دروازہ کھلا — ڈاکٹر عقیلہ جاوید — ۶۶

سلسلہ وار ناول:

۷۔ ایک مرد (قسط ۹) — اوریانا فلاشی/خالد سعید — ۶۹

تبصرہ:

۸۔ غربتِ شام دشتِ تنہائی — دل نواز دل — ۷۹

شاعری:

۹۔ دو غزلیں — ڈاکٹر خیال امروہوی — ۸۳
۱۰۔ چار غزلیں — خاور اعجاز — ۸۴
۱۱۔ دو غزلیں — پرویز ساحر — ۸۶
۱۲۔ دو غزلیں — ظفر اقبال نادر — ۸۷
۱۳۔ زرد چاند کا آخری دن (نظم) — خالد ریاض خالد — ۸۸
۱۴۔ سیلاب زدہ بستی (نظم) — خالد ریاض خالد — ۸۸
۱۵۔ خواب اور خاک کے درمیان (نظم) — ماورا احمد — ۸۹

حروفِ زر (قارئین کے خطوط):

۲۰۔ بنام مرتب — ۹۰

سید عامر سہیل

چند باتیں

ادبی منظرناموں پر نگاہ ڈالیں تو حافظ کے دو شعر بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قندست
قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

(بے وقوفوں کے لیے تو تمام تر گلاب اور قند کا شربت ہے جب کہ عقل مند کے لیے ساری روزی خونِ جگر سے دیکھتا ہوں ___ عربی گھوڑا پالاں کے نیچے زخمی ہو گیا جب کہ سونے کا طوق گدھے کی گردن میں دیکھتا ہوں)

کچھ یہی صورت حال ہمارے ادبی ماحول کی ہے۔ ادبی مراکز اور شہروں سے قطع نظر ہر جگہ یہی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے لیکن ''حقِ شاگردی'' کے بدلے ''استادانہ شفقت'' عنایت کی جارہی ہے، کہیں قوتِ زر سے تخلیقی ذہنوں کو خریدا جارہا ہے، کہیں سہروں کے بیچ خوشامد کی لڑیوں میں سے فن کو پامال کیا جارہا ہے تو کہیں ادبی ادارے کا سرپرست بن کر اپنے بے وزنی کو ''درآمدی وزن'' عطا کیا جارہا ہے۔ یہی کچھ نہایت تواتر کے ساتھ اور زور و شور سے جاری ہے۔ انہی حالات میں موقع پرستوں کے خوشامدانہ رویے، مصرعہ تک سیدھا نہ کرنے والوں کو علامہ فلاں ابن علامہ فلاں کا خطاب عطا کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ یہ سبھی حربے عارضی اور نقش برآب ثابت ہو جاتے ہیں مگر ان رویوں کی گرد ایسی اُڑائی جارہی ہے کہ اب اچھے اور بُرے، اصل اور نقل کا فرق بھی مٹتا چلا جارہا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ادبی مرکز میں کہ جہاں واقعی قابلِ قدر، محقق، ادیب، دانشور اور شاعر موجود ہوں وہاں ''آدھے کچے آدھے پکے'' لوگوں کو بڑے بڑے اعزازات اور منصب عطا کیے جارہے ہیں ___ اور شاید پھر وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہی اہلِ زر اور دوسرے درجے کے ادیب ہماری پہچان اور شناخت کا حوالہ بنیں۔ ڈرنا چاہیے اس وقت سے کہ جب جعلی منصب اور خطاب کے حامل افراد ہماری ادبی صفوں میں شامل ہوں گے ___ کیا ہی اچھا ہوتا کہ بے وقوفوں کی بجائے اہلِ دانش کو شربت و قند ملتا اور عربی گھوڑا بوجھ اُٹھانے کا کام سرانجام نہ دیتا ___ یہ سوچنے کا مقام ہے بلکہ ایک سطح پر ان منافقانہ رویوں کے خلاف بات کرنے کا وقت ہے۔ آیئے سچے اور حقیقی لوگوں کو ان کے صحیح مقام پر دیکھیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

باغ و بہار کی اُسلوبیاتی ساخت

''اُردو نثر لکھنے والوں میں میر امّن، جن نے ''باغ و بہار'' لکھا، سب پر فوق لے گیا۔ حقیقت میں نظم رکھنے میں جیسا کمال میر کو ہے، نثر لکھنے میں ویسا کمال میر امّن کو ہے۔'' (سر سیّد احمد خاں)

''لطف بیان کے لحاظ سے ''باغ و بہار'' سب سے عمدہ ہے۔'' (غالب)

''میر امّن جو کچھ لکھتے ہیں اپنے وقت کی نہایت فصیح و سلیس زبان میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اُن کو زبان پر بڑی قدرت تھی۔'' (محمد یحییٰ تنہا)

''باغ و بہار'' کی مقبولیت اور شہرت کا اصلی راز اس کی زبان اور طرزِ بیان میں پنہاں ہے۔'' (مولوی سیّد احمد)

''اُردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔'' (مولوی عبدالحق)

''میر امّن کی عبارت میں رنگینی، استعاروں کے ایجاز و اختصار اور محاوروں کے برتنے سے پیدا ہوئی ہے، نہ کہ استعاروں کے ہاتھ پاؤں توڑنے سے۔'' (ممتاز حسین)

''اس کے اُسلوب میں ایک مخصوص آہنگ ہے اور ایک خاص ہمواری ہے۔'' (عابد علی عابد)

''میر امّن نے عام طور پر اپنی نثر کو شاعرانہ طریقوں سے زندہ کرنے کی بجائے نثر کے خاص وسائل کے ذریعے موثر بنایا ہے۔ اُن کی اثر آفرینی کا بڑا حربہ تکرارِ الفاظ اور تابع مہمل کا استعمال ہے جس سے جوش اور خوش آہنگی پیدا کرنا مقصود ہے۔'' (ڈاکٹر سیّد عبداللہ)

''اُس کی انشاء اُس کی بقا کی ذمہ دار ہے۔ اُس میں جو زبان بول چال میں استعمال ہوتی ہے، اُس کا اوجِ کمال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے تکلف باتیں کر رہا ہے اور اُس کی باتیں ادب ہیں۔'' (کلیم الدین احمد)

''اُردو نثر، روزمرہ کی روانی اور ٹھیٹھ محاورے کے لُطف سے پہلی مرتبہ ''باغ و بہار'' میں آشنا ہوئی۔'' (حمید احمد خاں)

''اُنہوں نے اُردو کو ایک نیا اندازِ بیان دیا اور خاص نکتہ رسی سے کام لے کر اُس کو ہندی و فارسی کے الفاظ سے سجایا۔ وہ ایک مجدد کی طرح ہیں۔'' (ڈاکٹر اعجاز حسین)

درجِ بالا آراء میں میر امّن کی اُسلوبیاتی ساخت سے متعلق بہت سے اشارے موجود ہیں لیکن میر امّن کی نثری بُنت محض یہی کچھ نہیں۔ ہمارے ناقدین کا یہ کہنا کہ میر امّن، دلّی کا روزمرہ اور محاورہ

لکھ رہے تھے، درست نہیں۔ باغ و بہار کی تکمیل (نومبر ۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۲ء) کے زمانے میں شاہ حاتم (م:۱۷۸۲ء) کی اصلاحِ زبان کی تحریک کو بے شک دیوان زادہ کے دیباچے تک محدود نہ بھی کہیں، تو بھی یہ دیکھیں کہ میرامّن، دلّی سے نکلے کب؟ اُس دَور میں تو خود دلّی، اُردوئے مُعلا سے محروم ہے۔ پھر یہ دیکھیں کہ میرامّن کو دلّی کا محاورہ سننے اور برتنے کے لیے وقت کتنا ملا؟ اُس دور کی اکھاڑ پچھاڑ، اندرونی خلفشار اور بیرونی حملہ آوروں نے ہی تو میرامّن کو دربدر کیا۔ بے شک، میرامّن کے قریبی معاصرین میرزا رفیع سودا (م:۱۷۸۱ء) اور میر محمد تقی میر (م:۱۸۱۰ء) کی زبان اور میرامّن کی زبان کا موازنہ کر لیجیے۔ میرامّن نے عوامی بول چال کا لہجہ اور ذخیرۂ الفاظ سمیٹنے کا جتن کیا۔ لفظیات کے اشتراک کے سبب مجھے تو ایک ہی شاعر ایسا دکھائی دیا جو میرامّن (م:۱۸۳۶ء) سے قریب ہے اور وہ ہے ولی محمد نظیر اکبرآبادی (م:۱۶ اگست ۱۸۳۰ء)۔

میرامّن اور نظیر اکبرآبادی دونوں تذکیر و تانیث کے معاملے میں روزمرہ کی حد تک غلط العوام برتنے کے عادی تھے، نیز دونوں کے ہاں ایک ہی لفظ کے کئی کئی اِملا دیکھنے کو ملتے ہیں؟ جیسے گانو، گانوں، گاؤں ___ کنوا، کُوا، کنواں، کُوے۔ اکثر مقامات پر ''ماں'' کو ''ما'' لکھا لیکن ایک جگہ ''ماں'' بھی لکھا ہے۔ اُنھوں نے بے شک اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا، لیکن دہلی کے روزمرہ کو صحتِ لغوی پر ترجیح دی۔ مثال کے طور پر ''میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا۔'' ''کھانے اقسام اقسام کے'' یعنی جمع کے صیغہ کو واحد کے معنوں میں برتنا یا جمع کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے واحد کو برتنا۔ اسی طرح جمع الجمع لکھنا مثال کے طور پر سلاطینوں، اُمراؤں، یک لفظی سطح پر ''مہربانی'' کی جگہ ''مہربانگی''، ''جنہوں'' کی بجائے ''جن نے''، ''ٹھنڈی'' کی بجائے ''ٹھنڈھی''، ''تلاش'' کی بجائے ''تالاش''، ''لمبا'' کی بجائے ''لنبا''، ''بضد'' کی بجائے ''بجد''، ''ٹھنڈک'' کی بجائے ''ٹھنڈھک''، ''بھوک'' کی بجائے ''بھوکھ''، ''بیوپاری'' کی بجائے ''بپاری''، ''نہتے'' کی بجائے ''نہتھے''، ''زچہ'' کی بجائے ''بچا''، ''سامنے'' کی بجائے ''سامنھے''، ''بٹھایا'' کی بجائے ''بیٹھایا''، ''دِکھاتا'' کی بجائے ''دیکھاتا''، ''بے تحاشا'' کی بجائے ''بے تحاشی''، ''بھیک'' کی بجائے ''بھیکھ'' اور ''بھیجا'' کی بجائے ''بھجایا'' لکھنا۔ نیز یہ کہ میرامّن نے کچھ ایسے الفاظ بھی برتے ہیں جو پُورب (عظیم آباد/پٹنہ) میں طویل قیام کی چغلی کھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''چندہ جمع کر کے'' کی بجائے ''بہری کر کر'' اور ''شرابور'' کی بجائے ''شوربُور'' لکھنا۔

میرامّن کے ہاں بعض مقامات پر محاورے کی جو صورت دیکھنے کو ملتی ہے، اُس کی وضع وقت نے بدل دی۔ مثال کے طور پر میرامّن لکھتے ہیں: ''حیرت نے لیا''، اب ''حیرت ہوئی'' لکھا اور بولا جاتا ہے۔ میرامّن لکھتے ہیں ''نتھنوں میں دم ہے''، جدید صورت ''دم میں دم ہے''، میرامّن لکھتے ہیں ''کروٹیں کھا کر''، جدید صورت ''کروٹیں لے کر''، میرامّن لکھتے ہیں ''زمین پھاٹے تو میں سما جاؤں''، جدید صورت ''زمین پھٹے تو سما جاؤں۔'' میرامّن کے ہاں مترادفات کا استعمال بھی توجہ طلب ہے۔ ایک

مثال: ''مشکل کٹھن پیش آئی۔''

میر محمد حسین عطا خاں تحسین اور میرامّن سے قبل اُردو نثر پر دکنی لب و لہجہ حاوی دکھائی دیتا ہے اور ہندی بھاشا یا دوسری پراکرتوں کے الفاظ کا استعمال عام ہے جب کہ تحسین اور میرامّن کے ہاں پراکرتوں کی جگہ بالعموم، فارسی و عربی تراکیب و الفاظ اور بالخصوص ایک مقام پر ہندی نے لے لی۔ یوں ''نوطرزِ مرصّع'' اور ''باغ و بہار'' کی نثری بُنت اُردو نثر کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ میرامّن کے ہاں زبان کی سطح پر عوامی بول چال سے قریب رہنے کی کوشش میں محاورات و اندازِ بیان کا ترک و اختیار درج ذیل نقشے سے واضح ہوگا:

	باغ و بہار میں شامل لفظ قدیم	لفظ حال		باغ و بہار میں شامل لفظ قدیم	لفظ حال
۱۔	آگے ہی	پہلے ہی	۲۔	اپنی جوگا	اپنے لائق
۳۔	(جُوتا) اڑایا	(جُوتا) پہنا	۴۔	استدعا کر	درخواست کر
۵۔	(نشان) اُکھڑ آیا	(نشان) اُبھر آیا	۶۔	اَن بول	گونگا
۷۔	اُن کر	پلٹ کر	۸۔	اَنوٹھا	نِرالا
۹۔	اینچنا	کھینچنا	۱۰۔	بات بول کر	کہہ کر
۱۱۔	بَت کہاؤ	مفصّل گفتگو	۱۲۔	بَتیاتے ہیں	باتیں کرتے ہیں
۱۳۔	بَجد	بَھد	۱۴۔	بدا ہے	طے شدہ ہے
۱۵۔	برپا ہیں	قائم ہیں	۱۶۔	بعید ہے	خلاف ہے
۱۷۔	بَلیائوں	صدقے جاؤں	۱۸۔	بندھلا کر	پھُسلا کر
۱۹۔	بھاوے	اچھی لگے/اچھا لگے	۲۰۔	بھجایا	بھیجا/بھجوایا
۲۱۔	بھُلا وا	دھوکا	۲۲۔	بھیانک ہوکر	پریشان ہوکر
۲۳۔	(دروازہ) بیڑا	(دروازہ) بھیڑا	۲۴۔	بے وسواس ہوکر	بے خوف ہوکر

(نوٹ: میرامّن کے الفاظ اور تراکیب کی یہ امثال صرف الف اور ب کی پٹّی سے لی گئی ہیں۔)

اسی طرح میرامّن، زبان کے ورتارے میں تخلیقی اور اجتہادی شان پیدا کرنے میں بھی کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''انتظار کرنا'' کی بجائے فارسی محاورے انتظار کشیدن کی طرز پر ''انتظار کھینچنا''، ''جب نشہ چڑھتا ہے'' کی بجائے ''جب نشہ طلوع ہوتا ہے''، ''بہت آرزو ہے'' کی بجائے ''آرزو کمال ہے''، ''بدلی گھِر کر آئی تھی'' کی بجائے ''بدلی گھمنڈ رہی تھی''، ''کچھ بھی نہ کہا'' کی بجائے ''ایک بات منہ پر نہ رکھی''، ''غیر عورت پر نگاہ مت ڈال'' کی بجائے ''بگانے سَتّر پر نگاہ مت کر''، ''سوئم ہوگیا'' کی بجائے ''پھول اُٹھ چکے'' اور ''طے کر لیا'' کی بجائے ''جی میں ٹھہرالیا''۔

میرامّن اکثر عبارت میں ایک خاص طرح کا صوتی تاثر پیدا کرنے کے لیے مبتدا و خبر کی

ترتیب بدل کر من پسند نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''ماں باپ کے نام کو سب لاج لگنے کا ہے۔''، ''کب شام ہو کہ میرا مطلب تمام ہو۔'' یا ''بڑی فجر ہوئی۔'' اسی طرح مضاف و مضاف الیہ کی ترتیب بدل کر بھی انہوں نے عبارت میں اپنا من پسند تاثر قائم کیا ہے۔

میر امّن کے ہاں ''ادنیٰ'' کے لیے ''ادنا'' اور ''اعلیٰ'' کے لیے ''اعلا'' کی املائی صورت بھی دیکھنے کو ملتی ہے، جسے انجمن ترقی اُردو (ہند) اور بھارت کے بعض دیگر اداروں نے اپنا لیا۔ ''باغ و بہار'' میں کچھ صورتیں محاورے اور لغت کے خلاف جانے کی بھی دکھائی دیتی ہیں مثلاً

۱۔ ''شاہ بندر کو دستگیر کر کے اُسے مسلماں کے حوالے کریں۔'' دستگیر کے معنی ہیں معاون یا مددگار کے، جب کہ میر امّن نے یہ لفظ ''ہاتھ باندھ کر'' کے مفہوم میں برتا ہے۔

۲۔ ''اچھا اگر تم نہیں رہتے ہو تو میں ہی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تجھ کو اپنی جان کے برابر جانتا ہوں۔'' ''تم'' اور ''تجھ'' میں شُتر گربہ کی صورت ہے۔ اس نوع کی امثال میر امّن اور فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین و مترجمین، بلکہ اُس دور کے بیشتر قلم کاروں کے ہاں مل جاتی ہیں۔

۳۔ میر امّن بعض مقامات پر دو یکساں حروف میں سے ایک حرف کم دیتے ہیں جیسے ''نا اُمید'' کو ''نامید''، ''اُس سے'' کو ''اُسّے'' اور ''سننے'' کو ''سُنّے'' لکھتے ہیں۔

۴۔ ''باغ و بہار'' میں بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی محلِ نظر ہے۔ مثلاً ''سوچ'' کو مذکر اور ''غور''، ''خم''، ''شک'' اور ''خِلعت'' کو مونث لکھنا۔

مولوی عبدالحق نے صرف و نحو، نیز محاورے کے حوالے سے درج ذیل دس معاملات کی جانب اشارہ کیا ہے:

۱۔ جمع مونث اسم کے ساتھ فعل کی جمع، ان سے یا امدادی فعل کے ساتھ اصل فعل کی جمع کا استعمال جیسے
''دو کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گزرانیاں۔''
''یہ باتیں ہوتیاں تھیں۔''
''گھوڑے کی باگیں ڈال دیاں۔''

۲۔ ''نے'' کا استعمال یا ترک، بعض افعال کے ساتھ، جو حال کے محاورے کے خلاف ہے:
''القصہ رات کو چپکے، یہ دونوں بھائی اور کوتوال کے ڈنڈے نے مجھے اُس پہاڑ پر لے گئے۔''
''ذرا سُرت آئی تو میں اپنے تئیں مردہ خیال کیا۔''
''اس پروانگی کے سنتے ہی جوان نے آداب بجالایا۔''

۳۔ ''جب تلک'' کا استعمال، بغیر ''نہ'' کے:
''پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا، جب تلک وہ راضی ہوا۔''

۴۔ ''رنڈی'' بہ معنی عورت اور ''یتیم'' بہ معنی غلام لکھنا۔

۵۔ ''تم کو'' کی جگہ ''تمہوں کو'' لکھنا۔ گویہ صورت صرف ایک جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔

۶۔ ''نماز کر رہا تھا''، ''نماز کردن'' (فارسی) کا ترجمہ ہے۔

۷۔ ''ہوا نرم نرم بہتی تھی'' ہوا کا بہنا، پُرانا محاورہ ہے۔

۸۔ غلط اِملا کی بعض صورتیں مثلاً جیسا بولنے میں آتا ہے، ویسا لکھ دینا: ''جمیرات'' (جمعرات)، ''مرصّعے'' (مرصّع)، ''کہوتو صحیح'' (کہو تو سہی)

۹۔ اکثر مقامات پر اُردو مضاف، مضاف الیہ فارسی طرز پر برتے ہیں اور اُردو حروفِ اضافت آخر میں لکھے ہیں مثلاً: ''موافق معمول کے تقریر و خوش گوئی اس کی''۔ ایک مقام پر اضافتِ توصیفی لکھ کر موصوف کی جمع بنائی ہے: ''اور وہ خانہ زادِ موروثیوں کی قدر سمجھے گا۔'' بقول مولوی عبدالحق اگر خانہ زاد کی اضافت، کاتب کی غلطی بھی شمار کی جائے تب بھی ''موروثیوں'' بول چال کے لحاظ سے درست نہیں۔

۱۰۔ ''سار'' کا لفظ جیسے یا مانند کے لیے جگہ جگہ برتا گیا ہے: ''تم سار کا محبوب''، ''تجھ سار''، سار کا لفظ بہ معنی جیسے یا مانند، شمالی ہند میں مستعمل رہا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق، یہ لفظ دکن میں ''سری'' ہو گیا۔

میر امّن نے ''باغ و بہار'' میں صنائع بدائع، نیز شعری وسائل سے بھی کام لیا ہے اور اکثر مقامات پر کامیاب رہے ہیں۔

۱۔ ''تُو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا، لیکن ایک اِس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔'' (صنعتِ تجنیس)

۲۔ ''خدا نے مار کر پھر جلا دیا۔'' (تضاد)

۳۔ ''غصے کی آگ میں پھُک رہی ہوں، آخر جَل جَل کر بھُوبل ہو جاؤں گی۔'' (مراۃ النظیر)

میر امّن، اکثر ہم قافیہ الفاظ استعمال میں لاتے ہیں، جن سے تکلف کی نہیں بے ساختگی کی فضا بنتی ہے: ''سُبحان اللہ، کیا صانع ہے کہ جس نے ایک مٹھی خاک سے کیا کیا صورتیں اور مٹی کی مورتیں پیدا کیں۔'' ''معلوم نہیں خود بخود کیا غضب ٹوٹا، جو اُن کا آرام اور کھانا پینا چھوٹا۔''

میر امّن کے ہاں تشبیہات کا استعمال، خوب صورتی پیدا کرنے کا باعث بنا۔ اُن کی برتی ہوئی تشبیہات پیچیدہ، غیر مانوس اور دُور از کار یکسر نہیں:

۱۔ ''وہ بھُتنی بھی اُس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی، سچ مچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے۔''

۲۔ ''تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے، میں نے بھی وہ روز ویسی ہی بے قراری سے کاٹا۔''

میر امّن نے زبان پر محاورے کا رنگ چڑھانے کے لیے تابع مہمل کا استعمال کثرت سے کیا، جس سے تحریری زبان کی اجنبیت، بول چال کی مانوسیت میں ڈھل گئی، جیسے: ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے و پڑے پھینک پھانک دیئے۔ گھاٹ باٹ اس دُنیا کا دیکھوں۔ بانٹ بونٹ لینا۔ مناونا کر۔

دوڑ تا دھو پتا ساتھ ہولیا۔ عین مین۔ ننگا منگا فقیر بن کر۔

یہ صورت میر امّن نے اپنی وضع کردہ لفظیات سے بھی پیدا کی جیسے: اِندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اتارا۔ ہوا نرم نرم بہتی ہے۔ میرا نام لیوا، پانی دیو یا کوئی نہیں۔ بدلی بھی گھمنڈ رہی تھی، بوندیا بھی پڑ رہی تھیں۔ بادشاہ نے چاروں صورتوں کو طلب کیا۔ جب اُس کا نشہ طلوع ہوتا۔ جب تلک نتھنوں میں دم ہے۔ جَل بَل کر بھُوبل ہو جاؤں گی۔ میر امّن نے کچھ الفاظ ایسے بھی برتے جن کا تعلق بے شک دلّی کے روزمرہ سے ہے لیکن انشاء و ادب میں اُن الفاظ کا چلن اور ورتارا عام نہیں، جیسے: چبلّا، بللّی، پھسا ہندے، ناتھ، انچت، بتیانا، (جوتا) اڑیانا۔

اس حوالے سے دیکھیں تو میر امّن یکسر زنانہ اور گھریلو کہاوتوں کو بھی برتنے میں پہل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جیسے: بیل نہ کودا، کودی گون، یہ تماشا دیکھے کون۔ اوسر چُو کے ڈومنی، گاوے تال بے تال، سِر سے سِر واہ، جب بیل پھوٹی رائی رائی ہوگئی۔ یوں تحسین کی ''نوطر زمرصّع'' کے بعد ''باغ و بہار'' ہی ایک ایسی داستان ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ کردار وہی زبان بولیں جو اُن کی طبقاتی حیثیت، ذہنی سطح اور نفسی کیفیت کے مطابق ہو۔ اس ضمن میں میر امّن پوری طرح کامیاب نہیں رہے، لیکن انہوں نے کوشش ضرور کی۔ اُن کے بعض نسوانی کرداروں سے قطع نظر عورت کے اکثر مکالموں میں انہوں نے لب و لہجے، زنانہ محاورے اور زنانہ لہجے میں لوچ کا خیال رکھا۔ اس خصوص میں ملک زیر باد کی کنّیا کے مکالمے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں یہ خوبی ہندی الفاظ کے ورتارے سے پیدا ہوئی۔ جب کہ ''باغ و بہار'' کی پہلی شہزادی اور کُٹنی کے مکالموں کی سب سے بڑی خوبی اُن کی سماجی حیثیت کا تعین ہے۔

دہلی کے روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ جیسے ''بجد''، ''چَبلا''، ''کوتوال کے ڈنڈے''، ''بللّی'' اور ''ناتھ'' مکالموں میں خوب سجے ہیں۔ یہی صورت جمع الجمع (جیسے: سلاطینوں، اُمراؤں) اور یک لفظی سطح پر برتے گئے عوامی تلفظ (جیسے: مہربانگی، لنبا، ٹھنڈھک، بھجایا، بھوکھ، بپاری اور نہتھے) کی ہے۔ میر امّن نے تو مکالموں کو عوامی بول چال سے قریب رکھنے کی خاطر یہاں تک کیا کہ درست اِملائی صورت کو بھی عوامی تلفظ پر قربان کر دیا، جیسے: ''سہی'' کی بجائے ''صحیح''، ''ماں'' کی بجائے ''ما''، ''مرصّع'' کی بجائے ''مرصّے'' اور ''جمعرات'' کی بجائے ''جمیرات'' لکھا۔

''باغ و بہار'' کی زبان و بیان میں سادگی و سلاست کا عنصر، جس کی ہر ناقد نے تعریف کی اُس کا سبب ''باغ و بہار'' کا نصابی کتاب ہونا ہے اور فورٹ ولیم کالج کے مصنّفین، مولفین و مترجمین کی قدر مشترک۔ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی طرح اسے محض ''سادگی و سلاست'' تک محدود کر دینا بھی درست نہیں۔ یہ ننانوے فیصد دلّی کا روزمرہ ہے اور فورٹ ولیم کالج میں زیرِ تربیت سول سروس کے عہدہ داران کا عوام سے رابطہ بحال کرنے کا وسیلہ۔

میر امّن کا اُسلوب یکسر سادہ و سلیس ہرگز نہیں۔ اس میں سجع متوازن، سجع متوازی اور سجع

مُطرف کے علاوہ قوافی کا ایک خاص نظام دکھائی دیتا ہے۔ جس سے میر امّن کی نثر میں ایک خاص طرح کے آہنگ نے جنم لیا اور اُس آہنگ کی بنیاد حرکت پر ہے جسے میر امّن نے ہر قیمت پر برقرار رکھنے کے لیے جمع الجمع (سلاطینوں، اُمراؤں) اور یک لفظی سطح پر عوامی تلفظ (مہربانگی، لنبا، ٹھنڈھک، بھجایا، ماباپ، بھوکھ، بپاری، نہتھے) کو برتا۔ یوں میر امّن کے اُسلوب کو محض ''سادہ و سلیس'' کہنے سے اُس تخلیقی توانائی کا حق ادا نہیں ہوتا جو ''باغ و بہار'' میں پائی جاتی ہے۔ میر امّن کی تخلیقیت تب اُجاگر ہوتی ہے، جب ہم کالج ہٰذا کے دیگر مصنّفین، مولفین و مترجمین تا سر سیّد احمد خاں کے ہاں دکھائی دینے والی سادگی و سلاست میں جھلکنے والے سپاٹ پن کے مقابل ''باغ و بہار'' کو رکھ کر دیکھیں۔ بصورتِ دیگر سادگی و سلاست کا نقشِ اوّل تو ''آئین لشکری'' (۱۷۹۸ء) اور نقش ثانی: ''نوطرزِ مرصع'' ہے۔ طے شدہ مفروضوں پر نہ جایئے۔ اپنے تئیں ''آئین لشکری'' اور ''نوطرزِ مرصع'' کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔

سجع و قوافی کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ''باغ و بہار'' کی تخلیقی نثر کی سپلائی لائین جامع مسجد دلّی کی سیڑھیوں کی راہ سے فصیل ہند شہر دلّی سے جڑی ہوئی ہے اور اِس جُرأت نے میر امّن کے ہاں نہ صرف دلّی کے روزمرہ اور محاورے کی فوقیت کا احساس اُجاگر کیا، بلکہ اُردو کو بطور آزاد اور خودمختار (Independent) زبان کے برتنے کا شعور بخشا، فارسی کا ضمیمہ نہیں بننے دیا۔ ملک زیر باد کی کنّیا کے مکالموں کی سطح پر ہندی کا استعمال اسی خودمختاری (Independence) کا اعلامیہ ہے اور ''پِتا''، ''منتری''، ''مہاراج''، ''ماتا''، ''دیوان کا پُوت'' اور ''سُندر'' جیسے ہندی الفاظ کا استعمال بطور خاص توجہ طلب ہے۔

اب اگر ہم اُردو کو آزاد اور خودمختار زبان کے طور پر زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ''باغ و بہار'' میں موجود الفاظ و محاورات کی معنویت سے ازسرِ نو رُوشناس ہونے کا جتن کریں۔

☆☆☆

شوکت نعیم قادری

راشد کی نظم ''تصوّف'' پر ایک نظر

ہم تصوّف کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طولِ الم ناک کے پروردہ ہیں،
ایک تاریک ازل، نورِ ابد سے خالی!

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں
تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
اپنی دن رات کی پاکوبی کا حاصل پایا

ہم تصوّف کے نہاں خالوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا

ن م راشد کی یہ نظم اُن کے کلیات (۱) کے صفحہ ۵۵۰ پر درج ہے۔ صفحہ ۵۴۹ پر کلیات کے آخری حصہ کا آغاز اس عنوان کے تحت ہوتا ہے۔ 'دس نظمیں (جو کسی مجموعے میں شامل نہیں)' اسی صفحہ پر یہ حاشیہ بھی موجود ہے۔ 'یہ نظمیں (نیا دور، راشد نمبر) سے مِن وعَن لی گئی ہیں۔' ان دس نظموں میں سے یہ پہلی نظم ہے۔ ن م راشد ــــــ ایک مطالعہ، مرتّبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی (۲) میں ڈاکٹر صاحب نے 'پیش لفظ' میں صفحہ ۶ پر ان دس نظموں کے کسی مجموعے میں شامل نہ ہونے کی خبر دی ہے۔ یہی دس نظمیں کتاب کے آخر میں درج ہیں۔ یہ نظم صفحہ ۳۵۸ پر درج ہے۔

یہ مختصر نظم تین حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ تین مصرعوں کا حامل ہے۔ اس نظم کا مصرعِ اوّل ہی انتہائی کرخت اور قابلِ توجہ ہے۔ راشد کہتے ہیں کہ ہم تصوّف کے خرابوں کے مکیں ہیں۔ یہاں راشد نے کلمہ 'خرابہ' بہ معنیٰ 'ویرانہ یا کھنڈر' استعمال کیا ہے۔ جس نے 'تصوّف' کے حوالے سے اُن کی دُرُشتی عیاں ہے۔ یہاں 'تصوّف' ایک کردار سا بن کر سامنے آتا ہے۔ جس نے 'خرابوں' کی تشکیل کی ہے۔ اس مصرعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ 'تصوّف' بہ ذاتِ خود 'خرابہ' نہیں بل کہ اُس کے اثرات کے بہ

موجب جو 'خرابے' مُتشکّل ہوئے ہم لوگ اُنہی کے مکین ہیں۔ اگلے مصرعے میں یہ دُرُشتی مزید بڑھتی ہے کہ ہم 'تصوّف' کے خرابوں کے مکیں، وقت کے طولِ الم ناک کے پروردہ ہیں۔ 'طول' سے مراد 'وقت کا طول' ہے۔ 'وقت کا طول' سے ایک طویل عرصہ مراد ہے نہ کہ اِس کے پسِ پشت کوئی فلسفۂ وقت کارفرما ہے۔ نظم کے دوسرے حصے کا پہلا مصرع بھی یہی مفہوم لیے ہوئے ہے۔

ہم جو صدیوں سے چلے ہیں

یعنی ہم ایک طویل عرصے سے تصوّف کے خرابوں (ویرانوں) کے مکین ہیں۔ اب ماضی میں اِس طویل عرصے کا آغاز کب ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں۔ اِسی لیے تو طویل عرصہ کا آغاز ایک 'تاریک اَزل' بن گیا ہے مگر اِس مدت کا آغاز تو بہ ہر حال ہوا ہی تھا۔

مگر کب؟

ہمیشہ سے پہلے
ہمیشہ سے بھی سال ہا سال پہلے

راشد نے وقت کے اِس طویل عرصے کو 'الم ناک' کہا ہے یعنی یہ طویل عرصہ آلام سے مَملُو ہے اور ہم اُنہی مصائب کے پروردہ ہیں۔ ہماری پرورش، پُر درد ماضی کی گود میں ہوئی ہے۔ یہ پُر درد، دَور کب تک جاری رہے گا کوئی نہیں جانتا کیوں کہ اِس مدت کا انجام بھی 'نورِ ابد سے خالی' ہے۔

اب یہاں ایک نظر 'تصوّف' پر بھی ڈالتے ہیں۔ میرے نزدیک 'تصوّف' ایک خاص نوع کے طرزِ احساس، طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا نام ہے۔ تصوّف، ایک رویہ، ایک کیفیت اور ایک رجحان بھی ہے۔ برِصغیر کے سماج پر عرصہ دراز تک شہنشاہیت کا غلبہ رہا۔ حکم ران طبقے نے ہمیشہ اِس رجحان کی بھرپور حمایت اور حوصلہ افزائی کی تاکہ اُس کے خلاف مزاحمت کے خدشات کم سے کم ہوتے چلے جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ 'تصوّف' ایک خاص نوع کا ردِعمل یا احتجاج بھی ہے مگر اِس سے حکم ران طبقے کو کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ یہ متصوفانہ رجحان، بلا امتیازِ مذہب پورے برِصغیر پر غالب رہا۔ اِسی لیے تو راشد صیغہ جمع متکلم 'ہم' کا بڑا برمحل استعمال کرتے ہیں۔

راشد بنیادی طور پر ایک مغربی ذہن کے حامل تھے۔ انہوں نے بے شمار ممالک کی سیاحت کی پھر وہ ملازمت کے سلسلے میں مختلف ممالک میں بھی مقیم رہے۔ وہ عمل پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔ جب کہ تصوّف کے زیرِ اثر فرد اور معاشرے میں فاصلے بڑھتا ہے۔ راشد کے نزدیک یہ کیفیت بے عملی پر منتج ہوتی ہے اور یہی بے عملی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اِسی لیے راشد 'تصوّف' کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ راشد نے بھری جوانی میں 'خاکسار تحریک' میں شریک ہو کر ایک باعمل شخص ہونے کا ثبوت دیا۔ 'خاکسار تحریک' یقیناً اُس دَور کی ایک فعال تحریک تھی۔ ۱۹۳۸ء میں راشد، ملتان میں مقیم تھے اور یہاں وہ 'خاکسار تحریک' کے ایک فعال رکن اور سالار تھے۔ اپنے دوست آغا عبدالحمید کے نام ۱۳ فروری کے

ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں:

''میں اپنا تمام خالی وقت 'خاکسار تحریک' کی تقویت اور فروغ میں صرف کر رہا ہوں۔ میں ملتان کا سالار ہوں اور میرے ماتحت اِس وقت پچیس آدمیوں کا دستہ ہے ___ یہ تحریک خالص اور کسی قدر 'شدید' اسلام کے سوا کچھ نہیں۔ بے پناہ اور بے ضرر خدمتِ خلق، بے حد اُخوت اور محبت، عسکری تنظیم، اپنے امیر کی بے چوں و چرا اطاعت۔'' (۳)

اپنے اِسی دوست کو ۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان اور بالخصوص ہندی مسلمان کے 'زندہ' ہونے کا نسخہ ایک ہی ہے 'خاکسار تحریک'۔ اگر اِس نسخہ کو ہم نے استعمال نہ کیا تو اَبدی ہلاکت میں بہت کم مدت باقی ہے ___ تم اِسے 'صرف مذہب' نہیں پاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔'' (۴)

اِسی حوالے سے ایک واقعہ خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔ جس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ راشد

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

پر کس قدر یقین رکھتے تھے اور اِس پر عمل پیرا بھی تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے مضمون 'خاکسار تحریک اور ن م راشد' میں ایک دل چسپ واقعہ درج کیا ہے:

''جب میں اپنے گاؤں میں تھا۔ میری ملاقات ایک خاکسار سے ہوئی۔ یہ سن کر کہ میں اپنے گاؤں میں مقیم ہوں وہ چند میل کا فاصلہ پیدل طے کر کے میرے ہاں تشریف لائے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اِس لیے میں پانی کا انتظام کرنے کو اُٹھا۔ وہ میرا ارادہ بھانپ گئے اور بولے: 'پیاس تو مجھے ہے مگر میں آپ کو پہلے ہی بتا دوں کہ اگر آپ نے شربت پلایا تو آپ کو میری طرف سے ایک آنہ قبول کرنا ہوگا اور اگر سادہ پانی پلائیں گے تو جب بھی۔ اِس علاقے میں پانی اتنی مشکل سے فراہم ہوتا ہے کہ میں یہ بھی مفت نہیں پیوں گا۔ آپ کو اِس کے ایک دو پیسے لینے ہوں گے۔'' میں نے یہ سنا تو دم بہ خود رہ گیا۔ مہمان نوازی کی صدیوں کی روایات پر اس کاری ضرب نے مجھے چکرا ڈالا ___ میں نے کہا: مگر میں پانی کے دام وصول کرنے سے معذرت چاہتا ہوں۔' اور وہ بولے: 'اس صورت میں، مَیں پانی پینے سے معذرت چاہتا ہوں۔۔۔' میرے یہ مہمانِ عزیز اردو کے نامور شاعر ن م راشد تھے۔'' (۵)

اس نظم میں آگے چل کر راشد کہتے ہیں کہ ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے

ساحل پا لیا ہے یعنی ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہم نے اپنی دن رات کی پا کوبی کا حاصل پا لیا ہے۔ راشد کہتے ہیں کہ ہم اپنے تئیں اس گمان میں مبتلا ہیں کہ ہم نے منزلِ مراد کا حصول کر لیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اِس طویل سفر کا حاصل، لا حاصلی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نظم کے اِس حصے میں 'پا کوبی' کا لفظ معنی خیز ہے۔ اِس سے مراد 'طویل مسافت' بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس لفظ کا لغوی معنی 'پاؤں زمین پر دے دے مارنا' کے ہیں پھر اِس کے ایک معنی 'ناچنا' کے بھی ہیں۔ خانقاہی سلسلے کے تحت اس لفظ کو 'وجد و حال اور دھمال' کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

نظم کے تیسرے حصے میں راشد کہتے ہیں کہ ہم 'تصوّف' کے پوشیدہ ثمرات اور اثرات ہی کو 'نشانِ سرِ منزل' سمجھتے ہیں اور اِسی پر خوش ہو لیتے ہیں۔ وگرنہ ہماری یہ نام نہاد کامیابی، کامیابی نہیں بل کہ 'پامالی کا افسانہ' ہے۔ 'پامالی کے افسانے' کے تناظر میں ہم خانقاہی نظام سے منسلک استحصالی ٹولے اور اُس کے شکار سادہ لوح افراد کے افعال و کردار کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اکثر لوگ خرقِ عادت واقعات کو ہی اپنا سب کچھ مان کر خوش ہو لیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے واقعات تو استحصالی گروہ کے گھڑے ہوئے ہیں۔ اِسی لیے یہ تمام واقعات افسانے ہی تو ہیں۔ راشد کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے اِن رویوں کو ترک نہ کیا تو ہمارا انجام بھی ہے 'جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات کے' مصداق ہوگا۔ اگر ہم نے بے عملی کا اپنا یہ رویہ ترک نہ کیا تو ترقی کا حُصُول تو دَور کی بات ہم موت کے قریب پہنچ جائیں گے۔ راشد اپنی ایک اور نظم 'تعارف' میں کہتے ہیں۔

اجل، اِن سے مِل،
کہ یہ سادہ دل
نہ اہلِ صلوٰۃ اور نہ اہلِ شراب،
نہ اہلِ ادب اور اہلِ حساب
نہ اہلِ کتاب
نہ اہلِ کتاب اور نہ اہلِ مشین
نہ اہلِ خلا اور نہ اہلِ زمین
فقط بے یقین
اجل، اِن سے مت کر حجاب
اجل، اِن سے مِل!

ہم برِ صغیر کے باسی ایک طویل عرصے سے 'کیفیاتِ تصوّف' کے زیرِ اثر ہیں۔ اس طرح 'تصوّف' بھی ماضی ہی کا ایک دل کش روپ بن گیا ہے اور اپنے ماضی سے ہماری بھرپور دل چسپی بہ وُجُوہ مثالی رہی ہے۔ اگر ہم راشد کے تصورِ ماضی کا ادراک کر لیں تو اِس نظم کی تفہیم بھی سہل تر ہو جائے گی۔

راشد، ماضی کو پسند تو ضرور کرتے ہیں مگر ماضی پرستی سے گریزاں ہیں۔ وہ ماضی سے معانی تو کشید کرنا چاہتے ہیں مگر ماضی میں قیام کے خواہاں نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماضی پرستی کے جادوئی اثر سے ماضی ایک مرئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ ذہنی عدم مطابقت (Regression) کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ راشد کے تصورِ ماضی کے لیے اُن کا ایک مکتوب بہ نام ڈاکٹر سیّد عبداللہ (محررہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء، تہران) ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''میری زندگی میں یقیناً ماضی کی بڑی حقیقت ہے، لیکن مجھے اِس سے دل چسپی نہیں اور اس کی وجہ بھی میں نے بیان کی ہے کہ میرے نزدیک ماضی کے تجربات ہمارے آئندہ یا موجودہ مسائل کو حل نہیں کر سکتے (شاید چند تجربات کر سکتے ہوں، لیکن سب نہیں) اور میرے نزدیک ہماری قوم کا مسئلہ گزشتہ ہزار سال کا نہیں آئندہ ہزار سال کا ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ہمیں قوم کی حیثیت سے ماضی پر کم اور آئندہ پر زیادہ توجہ دینی چاہیے یعنی اپنے اندر اُس آئندہ کو محسوس کر کے اس کے لیے خود کو مسلح رکھنا چاہیے تاکہ ہم زندہ تر قوم بن سکیں۔ جو قومیں ماضی کی طرف زیادہ دیکھتی ہیں وہ بوڑھی قومیں ہیں۔ وہ اپنی یادوں کی رونق میں دن بسر کرنا چاہتی ہیں۔ جوان اور توانا قومیں جوان اور توانا افراد کے مانند صرف آئندہ کو دیکھتی ہیں۔ یہ بات میں نے بڑے دردِ دل کے ساتھ کہی ہے اور اِسے محض تمسخر سمجھ لینا بڑی زیادتی ہوگی۔'' (۶)

راشد نے اپنے کلام میں لفظ کی بے توقیری کے نوحے بھی رقم کیے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ منافقانہ روش کے تحت لفظوں کا بے دریغ استعمال انہیں بے توقیر کر دیتا ہے۔ اسی طرح 'تصوّف' سے منسلک الفاظ اور اصطلاحات کا بے تحاشا اور بے جا استعمال نہ صرف انہیں بے توقیر کر دیتا ہے بل کہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کے استحصال کا باعث بھی بنتا ہے۔ ایسی صورت میں الفاظ کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور اُن کے معانی کھو جاتے ہیں۔

سمندر کی تہ میں
سمندر کی سنگیں تہ میں
ہے صندوق ___
صندوق میں ایک ڈبیا میں، ڈبیا میں،
ڈبیا میں، کتنے معانی کی صبحیں ___
وہ صبحیں کہ جن پر رسالت کے در بند
اپنی شعاعوں میں جکڑی ہوئی

کتنی سہمی ہوئی!

راشد سے قبل اقبال نے 'تصوّف' کا ایک بالکل اچھوتا تصور دیا۔ جس میں رُہبانیت کو رد کر کے عمل پر زور دیا گیا ہے۔ اُن کے فلسفے میں تارکِ دنیا کی کوئی گنجایش نہیں۔ وہ سماجی مصائب سے نبرد آزما ہو کر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے ہی کو زندگی کہتے ہیں۔ وہ 'تصوّف' کے قدیم حوالوں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دِیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو، دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ
مانندِ بُتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
میراث میں آتی ہے اُنہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن!

(باغیِ مُرید)

علاّمہ اقبال اپنی انگریزی تصنیف "The Reconstruction of Religious Thought In Islam" کے Preface میں یوں رقم طراز ہیں:

"The more genuine schools of Sufism have, no doubt, done good work in shaping and directing the evolution of religious experience in Islam; but their latter - day representatives, owing to thier ignorance of the modern mind, have become absolutely incapable of receiving any fresh inspiration from modern thought and experience. They are perpetuating methods which were created for generations possessing a cultural outlook differing, in important respects, from our own." (۷)

ترجمہ: ''صحیح قسم کے سلسلہ ہائے تصوّف نے تو بے شک ہم مسلمانوں میں مذہبی احوال و واردات کی تشکیل اور رہ نمائی میں بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں، لیکن آگے چل کر اُن کی نمائندگی جن حضرات کے حصے میں آئی وہ عصرِ حاضر کے ذہن سے بالکل بے خبر ہیں اور اس لیے موجودہ دنیا کے افکار اور تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ وہ آج بھی انہیں طریقوں سے کام

لے رہے ہیں جو اُن لوگوں کے لیے وضع کیے گئے تھے جن کا تہذیبی مطمعِ نظر
بعض اہم پہلوؤں کے لحاظ سے ہمارے مطمحِ نظر سے بڑا مختلف تھا۔'' (۸)

اس حوالے سے راشد یقیناً اقبال کے ہم نوا ہیں۔ اپنے متذکرہ بالا خط میں وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کو لکھتے ہیں:

''میری تمام شاعری کے یا قریب قریب تمام شاعری کے مقاصد وہی ہیں جو
اقبال کی شاعری میں آپ کو عزیز رہے ہیں اور جو اسلام سے کسی طرح الگ
نہیں۔'' (۹)

راشد کی اِس نظم کا آخری Version نظم 'ریگِ دیروز' ہے۔ جو اُن کی تصنیف 'لا = انسان' میں شامل ہے۔ آخری Version کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے مگر میں نے اِس نظم کو اِس لیے موضوعِ بحث بنایا ہے کہ یہ نظم باقاعدہ طور پر 'کلیاتِ راشد' کی زینت ہے۔ 'ریگِ دیروز' میں راشد نے لفظ 'تصوّف' کی جگہ لفظ 'محبت' استعمال کیا ہے۔ اس طرح یقیناً یہ نظم آفاقی قدروں کی حامل ہوگئی ہے اور اُس کی معنویت میں بھی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ نظم 'تصوّف' کی تفہیم کے لیے اِس نظم کا مطالعہ ازحد ضروری ہے کیوں کہ 'تصوّف' بھی 'محبت' ہی کا ایک عکس ہے۔ جس کا تعلق ماضیِ بعید سے ہے۔ یہ ماضی 'ریگ' کی مانند ہے۔ جس پر ایک مضبوط مستقبل کی بنیادیں ہرگز استوار نہیں کی جاسکتیں۔ اب نظم 'ریگِ دیروز' ملاحظہ کیجیے۔

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طولِ الم ناک کے پروردہ ہیں،
ایک تاریک ازل، نورِ اَبد سے خالی!
ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا!

ہم محبت کے نہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشانِ سرِ منزل پایا

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
کنجِ ماضی میں ہیں باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ
اور کبھی فتنۂ ناگاہ سے ڈر کر چونکیں

نور ہیں سدِّ نگاہ نیند کے بھاری پردے

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں!
ایسے تاریک خرابے کہ جہاں
درد سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آہُو
ایک، بس ایک، صدا گونجتی ہو
شبِ آلام کی ''یاہو! یاہو''

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
ریگِ دیروز میں خوابوں کے شجر بوتے رہے
سایہ ناپیدا تھا، سایے کی تمنا کے تلے سوتے رہے!

(ریگِ دیروز)

یہ نظم راشد کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ ایک اہم نظم ہے جو ہم پر فکرِ راشد کے مختلف پہلوؤں کو منکشف کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کلیاتِ راشد، ن م راشد، ماورا پبلی شرز، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۱ء۔
۲۔ ن م راشد ___ ایک مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبۂ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء۔
۳۔ ایضاً ص ۲۳۳۔
۴۔ ایضاً ص ۲۳۴۔
۵۔ الاصلاح (ہفتہ وار) شمارہ ۱۵، جلد نمبر ۳۱، لاہور، ص ۱۵، ۱۶۔
۶۔ ن م راشد ___ ایک مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبۂ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۱۔
7. The Reconstruction of Religious Thought In Islam by Sir Muhammad Iqbal, Shaikh Muhammad Ashraf, Kashmiri Bazar, Lahore. 1958, Page.No.V.
۸۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، سیّد نذیر نیازی، بزمِ اقبال، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۳۵۔
۹۔ ن م راشد۔ ایک مطالعہ مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبۂ اسلوب، کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۲۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات (۵)

ادب اور معروضی حقیقت

نجم الاصغر شاہیا

تعارف:

نجم الاصغر شاہیا کا آبائی وطن جھنگ ہے تاہم ایک طویل عرصے سے وہ ملتان میں مستقل قیام پذیر ہیں۔ ملتان میں شعری فضا کی تشکیل اور ترویج میں اُن کا کردار بہت اہم ہے، وہ شعر کہنے والے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نزدیک شاعر کا حقیقی منصب درباداری اور مصلحت آمیزی نہیں بلکہ تخلیق فن کا فریضہ ہے اور اس فریضہ میں ان کا رویہ کسی غیر متوازن بات کو پسند نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے کچھ حالات کے پیش نظر اور کچھ مزاج میں تکمیلیت پسندی کے رجحان کی وجہ سے اُن کا کلام اشاعت کے وہ مراحل طے نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا تاہم شعری محافل، تنقیدی مجالس اور ادبی اجلاسوں میں وہ اپنے مخصوص لب و لہجے، شعری ندرت اور منفرد اندازِ بیان کے سبب خاص مقام رکھتے ہیں۔ ملک کے دیگر ادبی مراکز کی طرح ملتان میں بھی ''مشاعرہ باز لفافہ پرست شعرا''، اہلِ خانہ کو مشاعرے کی دعوت اور معقول ہدیہ کی ضمانت پر شعر پڑھنے والے اساتذہ اور ادبی ایوارڈ کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہانپتے کانپتے ادیبوں کی کمی نہیں۔ نجم الاصغر شاہیا نے خود کو ان ''دھندوں'' سے بچایا ہے اور سچے فنکار کی طرح شعری معیار کو ترجیح دی ہے۔

نجم الاصغر شاہیا کا اصل نام غلام اصغر شاہیا ہے، ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے، آبائی وطن جھنگ کے سکول ساڈھورہ مسلم ہائی سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج جھنگ سے گریجوایشن کی۔ ابتدا میں مختلف محکموں میں عارضی ملازمت کے بعد پاک آرمی کی الیکٹریکل اینڈ مکینیکل کور میں بطور سویلین سپروائزر کام کیا اور یہیں سے ۳۰ نومبر ۲۰۰۳ء کو ریٹائر ہوئے۔ دورانِ ملازمت تین سال کا عرصہ سعودی عرب میں گزرا۔

شاعری کا آغاز دسویں جماعت سے ہوا، جن اساتذہ سے سیکھنے کا موقع ملا اُن میں ظفر ترمذی، پروفیسر تقی الدین انجم اور غلام الثقلین نقوی کے نام اہم ہیں۔ دورانِ ملازمت شاعری میں تعطل آ گیا تاہم سعودیہ میں مالی آسودگی اور تنہائی کے سبب طبیعت پھر سے شعر کی طرف مائل ہوئی۔ اب گزشتہ بیس برسوں سے شعر گوئی میں مگن ہیں۔ اُن کا بہت سا کلام مشاعروں اور ادبی مجالس میں پڑھا اور سنا گیا مگر اب تک اُس کی باقاعدہ اشاعت نہیں ہوئی۔

نجم الاصغر شاہیا کی شاعری اپنے مخصوص لب و لہجے کے حوالے سے نمایاں ہے۔ اُن کے یہاں مشاہدے کی باریک بینی، تجربے کی آنچ، تخیل کی زرخیزی اور کرافٹ کی مضبوطی کا احساس جاگتا ہے۔ وہ لفظ کے استعمال میں نہایت احتیاط برتتے ہیں، تکمیلیت پسند طبیعت کی وجہ سے اپنی شاعری کو مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزارتے رہتے ہیں۔ اُن کی نظمیں اور غزلیں اردگرد کے ماحول، مزاج اور مناظر سے موضوعات حاصل کر کے ہمارے اندر کی دُنیا میں جھانکنے کا جتن کرتی ہیں۔ (مرتب)

نظموں کا انتخاب

ڈاک بنگلہ

فرازِ کوہ پر اِک ڈاک بنگلہ ہے
فرازِ کوہِ غم پر میرے دل کا ڈاک بنگلہ ہے
مرا دل بھی مری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی آبشاروں کے تناظر میں
سلگتی آرزوؤں کے چناروں، خواہشوں کے اُونچے اُونچے دیوداروں میں گھِرا
اِک انتہائی پُر فضا اور خوبصورت ڈاک بنگلہ ہے
یہ گرد و دُود کی آلودگی سے پاک بنگلہ ہے
سرِ دامانِ کوہِ غم
نہ جانے داغ ہائے ہجر کے کتنے نظر افروز و جاں پرور خیاباں ہیں
کہ صد جنت بداماں ہیں، یہ گلشن آپ خلّاقِ بہاراں ہے
نگارانِ ستارہ چشم و مہ طلعت
اگر اِن مرغزارانِ سرِ کہسار کی گلگشت کو آئیں
اِسی مہماں سرائے میں ٹھہرتے ہیں

یہ میرا نفسِ امّارہ بہت اچھا ملازم ہے،
رہے ہر وقت مہمانوں کی خدمت میں کمر بستہ،
یہ میرا جذبۂ اسفل جو اِس بنگلے کا مالی ہے ،
رکھے ہر میز پر تازہ تمنّاؤں کا گل دستہ،
مری کالی ہوس جو اِک پرانی مہترانی ہے،
رکھے صاف اِس کا ہر کمرہ، ہر اِک زینہ، ہر اِک رستہ
کوئی بستر لگاتا ہے کوئی پاؤں دباتا ہے
کئی ارماں پئے خدمت ہیں اِس بنگلے سے وابستہ
اگرچہ کوہِ غم ہے زلزلوں کا مستقل مرکز ،

ابھی تک ہو نہ پایا یہ مکاں بوسیدہ و خستہ
مگر اب لوگ کم آتے ہیں اِس مہماں سرائے میں
کہ مہمانوں کی رائے میں
یہ گھر رُوحوں کا مسکن ہے
کئی رازوں کا مدفن ہے

پرامرِ واقعہ یہ ہے
پرانے موسموں بیتے دنوں میں جتنے لوگ اِس گھر میں ٹھہرے تھے
وہ جن کے ساتھ گزرے دن سنہرے تھے

کسی مہمانِ نووارد کی آمد پر
پھر اُن سب کی حسین و جاں فزا یادیں
اکٹھی ہو کے آتی ہیں
یہاں محفل جماتی ہیں
بڑا ہنگامہ کرتی ہیں
بہت اُودھم مچاتی ہیں
کبھی کھڑکی پہ دستک دیں
کبھی در کھٹکھٹاتی ہیں
کبھی مہماں کو زیرِ لب
وہ یوں آواز دیتی ہیں
کہ جیسے اُس سے واقف ہوں
وہ اُس کا نام لیتی ہیں
اور اُس کو مشورہ فوراً
نکل جانے کا دیتی ہیں
یہی وہ غیر مرئی واقعہ ہوتا ہے جس سے ہر مقیمِ نَو سمجھتا ہے
کہ اِس گھر پر اب آسیبوں کا قبضہ ہے
یہ پراسرار و دہشت ناک بنگلہ ہے
فرازِ کوہِ غم پر میرے دل کا ڈاک بنگلہ ہے

ساگوان بھاگوان

اَے ساگوان بھاگوان
بخت کے دھنی غنی
تری ہی چوبِ مشکبو
سے اُس سجیلی کامنی
کے مرمریں محل کی ہیں
تمام کھڑکیاں بنی

وہ مرگ نین پدمنی
وہ سانوری سروجنی
محل کا جب کوئی دریچہ وا کرے
تو اُس حسین ساحرہ کا دستِ مہرباں تجھے
کسی مسیح کی طرح حیاتِ بعد مرگ پھر عطا کرے
تری مری ہوئی حسوں میں دوڑ جائے معجزے کی خوش گوار سنسنی
اگر کبھی وہ موہنی
چڑھا دے گھٹ سے چٹنی
گلی میں مجھ کو دیکھ کر، کھڑے ہوئے
تو اُس سمن بدن کی اُکھڑی اُکھڑی سانس کی مہک
تری کٹی ہوئی رگوں میں نغمۂ بہار پھر سے چھیڑ دے
وہ چھیڑ دے ترے نُمونا آشنا بدن میں پھر سے تتلیوں کی راگنی
ہری رُتوں کی سمفنی
عجب انوکھی سنکھنی

نہ آئے تجھ پہ رشک کیوں
کہ تیری دسترس میں ہے

وہ گلعذار و گلبدن
جو قید اِس قفس میں ہے
وصال کیسے ہو کہ وہ
حفاظتِ عسس میں ہے

پسِ فصیلِ آہنی
سپاہِ اُردا بیگنی
غلام گردشوں میں تعینات ہے
ہر ایک کنج میں عصا بدست پہرے دار ہیں
میں اُس کا ہاتھ چھو سکوں مرے نصیب میں کہاں یہ بات ہے
تُو کتنا خوش نصیب ہے کہ اُس کا قرب پا گیا، ترا یہ اوج دیدنی
مری تو جان پر بنی
اے بے نیاز جانکنی
خدا کرے حسد سے تُو بچا رہے
نثار تجھ پہ پربتوں کی گنگناتی ندیاں
نثار تجھ پہ، ہم صفیر طائروں کے کارواں، ترے لئے
دلوں میں اپنے رکھتے ہیں پہاڑ کے سبھی شجر، سبھی نہالِ دامنی
رقابت اور دشمنی
حسد بھری گھناونی

ترے حریف نابکار
چیڑ اور دیودار
پائی، کائیل، آبنوس
شہ بلوط اور چنار
چندن اور مہاگنی
اے بخت کے دھنی غنی
اے ساگوان ، بھاگوان

اشک آباد

ایک اشک آباد
دارُالسلطنت ہے تُرکماں کا
ایک اشک آباد
مرکز ہے مری اقلیمِ جاں کا

تُرکمانستاں کے اُس قصبے کی شان اُس کی کشادہ جگمگاتی شاہراہوں اور اُس کے بیش قیمت مُلکی و درآمدی اسبابِ صرفہ سے بھرے مصروف بازاروں سے ہے
میرے دل کی وادیٔ احساس کے اِس شہر کی رعنائی ، اِس کی دلکشی ، اِس کا سبھاؤ حسرتوں اور آرزوؤں کے خیابانوں ، امنگوں اور جذبوں کے چمن زاروں سے ہے

کوئی رُت ہو گل فشاں رہتے ہیں نا آسودہ جذبوں کے یہ دلکش مرغزار
یہ مری نارس تمنّاؤں کے گلشن ، خون ہوتی خواہشوں کے لالہ زار
سینچتی ہے ہر خیاباں کو مرے اِک گریۂ بے ساختہ کی جُوئبار
میری سرد آہوں کے جھونکے اِن مہکتی گل زمینوں کے لئے بادِ بہار

یہ چمن ہیں آپ خلّاقِ بہاراں
ڈر نہیں اِن کو کسی عہدِ خزاں کا
اِن کی سیرابی ہو میرے آنسوؤں سے
یہ نہ کھنچیں اِنتظار ابرِ روں کا

ایک نقشہ
ہو بہو باغِ جناں کا
یہ جو مرکز
ہے مری اقلیمِ جاں کا

☆☆☆

موٹر لانچ میں ایک مکالمہ

سیّاح

مانجھی تُم جو ساگر ساگر گھومتے ہو سَیلانی ہو
کبھی وہ آنکھیں دیکھیں جن میں رنگ بدلتا پانی ہو
میں تو کہوں یہ ناؤ کسی ہم پیشہ کو ارزانی ہو
اپنے دل کا بجرا لو اور جب موسم رومانی ہو
اُن شفّاف خلیجوں میں بھی کچھ دن کشتی رانی ہو

ملاّح

اپنا کام ہے نیّا کھینا جس بھی رنگ کا پانی ہو
پانی میں ٹھہراؤ ہو یا تُند و تیز روانی ہو
مانجھی خوف نہ کھائیں ساگر جتنا بھی طوفانی ہو
آنکھوں میں تو لیکن برقی لہروں کی طغیانی ہو
اُن میں تو وہ اُترے جس نے مر جانے کی ٹھانی ہو

☆☆☆

زینیا

گھر گھر برتن مانجھنے والی اِک لڑکی سے میں نے پوچھا
''اے بیٹی کیا نام ہے تیرا''؟
''زینیا'' انکل

(زینیا اِک دوپہر کی جلتی دُھوپ میں کھلنے والا پھول)

اُس دُکھیا لڑکی کی ماں نے کیسا اُس کو نام دیا
جیسی قسمت ویسا اُس کو نام دیا
لیکن نام سے کیا ہوتا ہے
نام صنوبر ہو کہ بَبُول
میں نے دیکھے
عشرت اور مسرّت نام کے لوگ بھی سخت آزُردہ، ملُول
دُکھ کی سلگتی راکھ میں راکھ
وقت کی اڑتی دُھول میں دُھول
سب کے لئے اِک دستِ ستم گر
سب کے لئے اِک موجۂ صرصر
سب کے لئے اِک فطرت کا بے رحم اُصول
سب نے رزقِ خزاں ہونا ہے
کوئی رات کی رانی ہو یا دُھوپ میں کھلنے والا پھول

☆☆☆

الماری کا قبرستان

لکڑی کے تختوں پہ کتابیں
اِس ترتیب سے چنی ہوئی ہیں
یوں آپس میں جڑی ہوئی ہیں
جیسے قبرستان میں قبریں

جِلدوں والی ساری کتابیں پکّی قبریں
غیر مجلّد کچّی قبریں
کچھ تازہ
کچھ بہت پرانی
کچھ بے حد بوسیدہ شکستہ
یہ مرقد ہیں اُن لوگوں کے
موت کے بعد بھی جو زندہ ہیں

ہر اک قبر پہ صاحبِ قبر کا نام لکھا ہے
ہر اِک لوح پہ نام کے ساتھ دوام لکھا ہے
ایک بیاض ہے میری بھی اِس الماری میں
جس میں میں نے اپنا سارا کلام لکھا ہے

پھر جب اِک دن
میں بھی اپنے لکھے لفظوں کی
چادر اوڑھ کے سو جاؤں گا
دفن کتاب میں ہو جاؤں گا
مجھ کو یقیں ہے
میں بھی اِس اپنی قبر میں صدیوں زندہ رہوں گا
میں نے بھی ایسے لفظ لکھے ہیں مر نہ سکوں گا

پرندے کے بچّے

پرندے کے بچّے نشیمن سے دیکھیں
تو لگتا ہے باغ اُن کو اِک گہری کھائی
اُنہیں حُسنِ نسرین و گل کی خبر کیا
کہ دیتی ہے موت اُن کو نیچے دکھائی
مگر وہ اُسی وقت تک خوف کھائیں
کہ جب تک نہ اُن کے پَر و بال آئیں

مری بچیاں گھر کے رَوزن سے دیکھیں
تو دیکھیں خیاباں خیاباں سی بستی
رہیں یہ بھی خائف کہ کھائی سے گہری
ہے بستی کے لوگوں کی اخلاقی پستی
یہ دہشت زدہ عمر بھر ہی رہیں گی
ہمیشہ یہ بے بال و پَر ہی رہیں گی

☆☆☆

پانی

ہوا سمندر سے جتنا پانی اٹھا کے لائے گھنے گھنے بادلوں کی صورت
وہ جب برستا ہے کوہ و میداں پہ برف اور بارشوں کی صورت
تو قطرہ قطرہ اکٹھا ہو کر بپھرتے دریاؤں تند خُو ندیوں کی صورت
کہیں چٹانوں سے سر پٹختا کہیں زمینی رُکاوٹوں کو عبور کرتا
مہیب صحراؤں سے گزرتا، جنونیوں وحشیوں کی صورت
بالآخر اِک روز پھر سمندر میں مل ہی جائے
دو ہجر کے مارے غم زدہ ساتھیوں کی صورت

ہیں میری چشمانِ تر بھی دو ساگروں کی صورت
گھٹائیں غم کی جب اٹھتی ہیں اِن سمندروں سے
تو میرے دامن میں کتنا پانی برستا ہے آنسوؤں کی صورت
مگر وہ آنسو نہ واپس آئیں کمان سے نکلے گم شدہ ناوکوں کی صورت

☆☆☆

کرنسی نوٹ

ایک کرنسی نوٹ کو دیکھو
بوسیدہ بھی ہو جائے تو
اُس کی مقرّرہ کردہ قیمت گھٹتی نہیں ہے
اُس کی بیع و شراء کی قوت گھٹتی نہیں ہے
پھٹ جائے تو ٹیپ لگا کے جوڑ دیں اِس کو
پھٹ کر بھی اِس کی مالیّت گھٹتی نہیں ہے

بنک وصول کریں سب اِس کو
لوگ قبول کریں سب اِس کو

سو کا پھٹا پرانا نوٹ بھی سو کی قیمت رکھتا ہے

کاغذ سے بھی بے وقعت ہیں
بوڑھے عمر رسیدہ لوگ
دو کوڑی کے بھی تو نہیں ہم
خستہ تن بوسیدہ لوگ

☆☆☆

کالا شیشم

ہوس پرست آدمی بھی ہوتا ہے ایک شیشم کے پیڑ جیسا
کہ جوں جوں دونوں کی عمر بڑھتی ہے
دونوں اندر سے ہوتے جاتے ہیں سخت کالے
یہی سیاہی جو ایک شیشم کے پیڑ کا افتخار ٹھہرے
یہی سیاسی اِک آدمی کے گلے میں ذِلّت کا طوق ڈالے

سیاہ جتنی ہو چوبِ شیشم
وہ گھُن کے لگنے سے اتنی محفوظ و بے خطر ہو
اور اِس کے برعکس آدمی ہو سیاہ باطن
تو اُس پہ حرص و ہوس کی دیمک کا حملہ الٹا شدید تر ہو

کسی کو مارے سفیدی تن کی،
کسی کی دشمن ہے من کی کالک
درخت شیشم کا بوڑھا اچھا
اور آدمی جب تلک ہو بالک

☆☆☆

لینڈ سلائڈنگ

بلند و بالا پہاڑ ہیں ہر طرف دُکھوں کے
اور اِن پیالہ نما پہاڑوں میں
جا بجا کروٹیں بدلتی شکستہ خستہ سی اِک سڑک ہے
امید کا راستہ یہی ہے

یہ تنگ و پُر پیچ راہ جاتی ہے اِک ستم گر کی بے حسی کے گلیشیئر تک
ہمیں پہنچنا ہے اُس وفا ناشناس ظالم کی سرد مہری کے مُستقر تک
کہ جس کے لہجے کی سخت برف آفتابِ داغِ فراق کی تیز دُھوپ سے بھی پگھل نہ پائے
مگر ابھی ہم مقامِ آغاز پر پڑے ہیں، ہم اپنے پہلے پڑاؤ سے بھی نکل نہ پائے
کہ ہے یہ موسم
گریز و بے اعتنائی و بے مروّتی کی
شدید دوّار، زلزلہ بار، حشر آثار، تند طوفانی، زمہریری ہواؤں کی ہولناکیوں کا
بہت ہی ناخوش گوار موسم
بہت ہی بے اعتبار موسم

کئی دنوں سے امید کی شاہراہ پر اب
جگہ جگہ اُس حسیں ستم گر کی سرد مہری کی برف کے خوفناک تودے
غرور و نخوت کے بھاری بھاری مہیب پتھر گرے ہوئے ہیں
یہ شہرِ حسرت ہے جس میں پچھلے کئی دنوں سے
ہم آرزوئے مسافرت میں رُکے ہوئے ہیں
وصال کے اِس سفر پہ نکلیں تو کیسے نکلیں
کہ جو بھی آئے
وہ ایک تازہ سلائیڈنگ کی خبر سنائے

نتھیا گلی میں ایک رات

کوہِ بلند کے دامن میں مخروطی گھروں کی چمکیلی ڈھلوانی چھتوں پر
ژالہ باری کا اپنا ہی نظّارہ ہے
میں تو وہ دلکش منظر اب تک بھول نہ پایا
جب اِک رات اچانک برف کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے
نتھیا گلی میں اِک نجی مہمان سرا کی ٹین کی چھت یوں بجنے لگی تھی
جیسے چھت پر کوہ کی پریاں گھنگھرو باندھے ناچ رہی ہوں
اِیسی دلکش تال اور ایسا شیریں آہنگ
ٹین کی چھت کے نیچے میں تو جھوم گیا تھا

کاش اُس رات اُس قریۂ کوہ میں وہ بھی ہوتی
جس کے اچھوتے حسن نے میری عقل پہ پردہ ڈال رکھا ہے
شاہ بلوط کی کڑیوں والے اُس گھر کی، اُس ٹین کی چھت جیسا اِک پردہ
پھر اُس رات جب اولوں کا طوفان تھما تو یادوں کے بادل گھِر آئے
ہونے لگی پھر ذہن کی چھت پر ژالہ باری
عقل کا چمکیلا پردہ بھی بجنے لگا تھا
کوہ کی گہری خامشی میں اِس پردے کا بھی
ساز تھا ایسا دلکش میں تو جھوم گیا تھا

☆☆☆

زندگی بے رحم استانی مری

میں تو اب بھی ایک طالب علم ہوں
عرصہ گاہِ دہر ہے میرا اسکول
ایک ہی درجے میں ہوں برسوں سے میں
وقت سارا کھو دیا میں نے فضول
ہائے ناسمجھی مری
وائے نادانی مری
زندگی بے رحم استانی مری

زندگی مجھ کو پڑھاتی ہے دکھوں کی آگ میں
جسم کو کندن بنا دینے کا علمِ کیمیا
وہ پڑھاتی ہے محبت کی لطافت کے پسِ پردہ چھپی
باطنی نفرت کی تہ در تہ کثافت کو پرکھنے کی طبیعیات بھی
وہ پڑھاتی ہے ستارہ چشموں اور مہ طلعتوں کی نفسیات
جبرِ غم کا فلسفہ، حسرت شماری کا حساب
کیا کہوں کتنا ادق ہے یہ نصاب
میں کہ اِک کمزور طالب علم ہوں
سخت مشکل کامیابی کا حصول
ایک دن کرتا ہوں یاد آموختہ
اگلے دن جاتا ہوں بھول
کب سے جاری ہے یونہی اوراق گردانی مری
زندگی بے رحم استانی مری

ہے بہت لائق یہ استانی مگر
انتہائی سخت ہیں اس کے اُصول
کتنا ہی مجبور کوئی کیوں نہ ہو
عرضیٔ رخصت نہیں کرتی قبول
کاٹ دیتی ہے یہ اُس کا نام ہی
جس کی بیماری پکڑ جاتی ہے طول
دے کڑی نالائقوں کو یہ سزا
میرا بھی نا لائقوں میں ہے شمول
اِس قدر کھائی ہے میں نے اِس سے مار
ہل گئی ہے جسم کی ایک ایک چُول
زندگی لیتی ہے گاہے گاہے میرا امتحان
امتحاں میں اور بڑھ جائے پریشانی مری
زندگی بے رحم استانی مری

طفلِ مکتب ہوتے ہیں جب امتحاں میں کامیاب ،
ڈالتے ہیں جا کے استانی کی گردن میں وہ پھول
ایک میں جو جانتا ہوں کیا نتیجہ آئے گا
گھر میں ہی اُس دن پڑا رہتا ہوں افسردہ ، ملول
یا کہیں بیٹھا رہوں جا کر کنارِ جُو اداس
یا کسی ویراں سڑک پر پھانکتا رہتا ہوں دُھول

میں کہ آوارہ مزاج
میں کہ اِک طفلِ شریر
میں کہ اِک کم کوش طالب علم ہوں
زندگی کو زہر لگتی ہے تن آسانی مری

کر رہی ہے اب تو وہ بے حد نگہبانی مری
در گزر ہوتی نہیں اب کوئی شیطانی مری
روز دے مجھ کو سزا یہ دشمنِ جانی مری
اور اُسے غصہ دلائے اشک افشانی مری
بجھ گئی ہے ساری رعنائی و تابانی مری
کیا سناؤں داستانِ غم ہے طولانی مری
کب نہ جانے ختم ہو گی یہ سبق خوانی مری

میں تو اب بھی ایک طالب علم ہوں
عرصہ گاہِ دہر ہے میرا سکول
زندگی بے رحم استانی مری

☆☆☆

انتخاب غزلیات

☆

سوگوار ایسا ترے جانے سے گھر لگتا ہے
آبخورہ بھی مجھے دیدۂ تر لگتا ہے

نُوح کا سَیل بھی تندور سے ہی پھوٹا تھا
جلتی آنکھوں سے بہیں اشک تو ڈر لگتا ہے

دشتِ تصویر میں اب ڈھونڈتا ہوں راہِ فرار
جیسے اِک چڑیا کو آئینہ بھی در لگتا ہے

ڈوب جاتے ہیں اچانک ہی اُمیدوں کے جہاز
اُس کی آنکھوں میں کوئی مخفی بھنور لگتا ہے

زخم ہی زخم مِرے تن پہ ہیں نجم الاصغؔر
مَیں وہ کنڈیاری جسے سُرخ ثمر لگتا ہے

☆

قدرت نے کوئی کام بھی مجھ سے لِیا نہیں
وہ تیر ہوں کماں سے جو اب تک چلا نہیں

روشن ہے چشمِ تر میں بھی اُمید کی کِرن
تالاب میں بھی گِر کے یہ جگنو بجھا نہیں

نفرت کی جس چٹان سے پھسلائیں اس کے ساتھ
اِک نخلِ دستگیر تھا سو مَیں مرا نہیں

ہے زندگی وہ کوہ کی پیچیدہ شاہراہ
جس کے کسی بھی موڑ پہ نصب آئینہ نہیں

اصغؔر کی شخصیت کو نہ دیکھ اُس کے فن کو دیکھ
ہے روشنی تو تیز جو شعلہ بڑا نہیں

☆

دفاع اِتنا نہ تھا کمزور پر غم کا غضب ٹوٹا
تو پہلے حملے میں دروازۂ شہرِ طرب ٹوٹا

کِیا تھا قید خاموشی کے زِنداں میں تجھے کِس نے
پھر اب کِس اِسم کے ابجد سے تیرا قفلِ لب ٹوٹا

بہت نازاں تھی اپنی مستجابی پر مگر اب کے
وہ یوں رُوٹھا کہ پندارِ دُعائے نیم شب ٹوٹا

وفا کی بھیک کب تک مانگتے بے مہر لوگوں سے
چلو اچھا ہوا یہ دل یہ کشکولِ طلب ٹوٹا

حق و باطل میں آویزش رہی ہر دَور میں اصغؔر
اُٹھا جب بھی کسی ہادی پہ دستِ بُولہب ٹوٹا

☆

جاں بلب عُدو کی بھی پیاس تو بجھانی ہے
کیا کسی کی آنکھوں کی چھاگلوں میں پانی ہے

اُس نگار کے گھر تک اِک سفر ہے صدیوں کا
راستہ زمینی ہے ، فاصلہ زمانی ہے

اب بھی دل میں زخموں کے گل کھلائے رکھتا ہوں
کم سِنی سے ہی مجھ کو شوقِ باغبانی ہے

زخشِ زندگی میں اب دم نہیں پہ ہیں جب تک
بھیڑیے مرے پیچھے ایڑ تو لگانی ہے

پھول بیچنے والی ہے خزاں میں افسردہ
اصغؔر آج اُسے دِل کی گُل زمیں دکھانی ہے

☆

نہیں کچھ کھوٹ مجھ میں پرکھ اپنا شک نکالے گا
کسوٹی پر بھی پرکھے گا، کٹھالی میں بھی ڈالے گا

ابھی جذبے ہیں خوابیدہ ابھی ہلچل نہیں اِن میں
کوئی ماہِ تمام آ کر سمندر کو اُچھالے گا

میں پستی میں پڑا ہوں جس طرح ہو چاہ میں پانی
جسے ہو گی ضرورت خود مجھے آ کر نکالے گا

اکیلا رو رہا ہے یہ چل اِس کا ساتھ دیتے ہیں
ہماری شرکتِ غم سے یہ کچھ آنسو بچا لے گا

میں اصغؔر زندگی میں ایک نصب العین رکھتا ہوں
یہ مقصد جب ہوا پورا خدا مجھ کو اُٹھا لے گا

☆

بند تھا گھڑیال بھی دیوار پر لٹکا ہوا
اُس قفس میں وقت بھی تھا دار پر لٹکا ہوا

اپنی ناکردہ گناہی کی گواہی آپ ہوں
میں صلیبِ کیفرِ کردار پر لٹکا ہوا

زندگی میں بارہا ناکام ہونا ہے ابھی
کیوں ترا چہرہ ہے پہلی ہار پر لٹکا ہوا

فرض پہلے یا محبت ہے ابھی تک فیصلہ
عقل و دل کی باہمی تکرار پر لٹکا ہوا

سر پہ دستارِ فضیلت جب تلک اصغؔر رہی
ایک خنجر بھی رہا دستار پر لٹکا ہوا

☆

کھلا جو یاد کا بادل تو ذہن صاف ہوا نیلگوں فلک کی طرح
تھمی جو اَشکوں کی بارش تو اِک خیال اُبھر آیا پھر دھنک کی طرح

دُکھوں سے لڑتے ہوئے مَیں تلاش کر ہی رہا تھا فراد کا راستہ
کہ ایک جیش اُمیدوں کا مجھ سے آن مِلا تازہ دم کُمک کی طرح

غموں کا بھاری ٹریفک کسی بھی حصے میں دن رات کے نہیں رُکتا
میرا بدن بھی ہو جیسے کسی تجارتی مرکز کی اِک سڑک کی طرح

ضروریات ہوں مہنگی بھی دستیاب تو گرتا نہیں طلب کا گراف
محبتیں بھی ضروری ہیں آدمی کے لیے گندم و نمک کی طرح

قلم کی دھار سے تلوار کا بھی کام لیا مَیں نے بارہا اصغؔر
اگرچہ صاحبِ سیف و قلم نہیں ہوں مَیں خوشحال خاں خٹک کی طرح

☆

تجھے خبر ہے کہ کاٹ دیتا ہے ایک جھرنا پہاڑ آخر
مَیں اپنے اشکوں سے تیرے دل میں بھی ڈال دوں گا دراڑ آخر

اُتر ہی جاؤں گا تیری آنکھوں کے راستے سے مَیں تیرے دل میں
تجھے بچائے گی کب تلک یہ گھنیری پلکوں کی باڑ آخر

مَیں آؤں گا ایک حبس موسم میں تازہ ٹھنڈی ہوا کی صورت
رکھو گے پھر مجھ پہ بند کب تک تم اپنے گھر کے کِواڑ آخر

جب ان کی کچھ بھی طلب نہیں ہے کوئی خریدار اب نہیں ہے
سجاؤں کب تک دکان دِل میں محبتوں کا کباڑ آخر

کمالِ فن کار بے نتیجہ کہ اب تک اُس کا نہ دل پسیجا
اگر وہ پتھر ہے نجم الاصغر تو کیوں میں جھونکوں یہ بھاڑ آخر

☆

دل وحشی تو اب بھی اُس گلی میں جا نکلتا ہے
ڈھلے بھی عمر تو سر سے کہاں سودا نکلتا ہے

کوئی ملتا ہے صرف انسانی ہمدردی کے ناطے سے
مگر پھر سلسلہ جانے کہاں تک جا نکلتا ہے

اگر بے غم ہو تم تو دوست کا غم پال لو دل میں
کہ لے پالک کبھی بیٹے سے بھی اچھا نکلتا ہے

لباسِ زندگی ہو جائے گر دِ غم سے جب میلا
تو دھو آنکھوں کے پانی سے بڑا اُجلا نکلتا ہے

لگاتا ہوں مَیں غوطہ روز قعرِ فکر میں اصغؔر
کبھی موتی نکلتا ہے کبھی گھونگھا نکلتا ہے

☆

روغنِ لالہ و گل ہے کہ وریدوں میں لہو
پھوٹتی ہے بدنِ یار سے کیسی خوشبو

دامنِ کوہ میں گُلرُخ ہو کوئی ساتھ اگر
آبِ جَو کی طرح دیتا ہے نشہ آبِ جُو

بارشِ غم ہو مرے ذہن کی چھت پر اِک دن
چھت کئی روز ٹپکتی رہے آنسو آنسو

گاؤں کی گلیوں میں قندیل بکف پہرے دار
بن میں سوئی ہوئی چڑیوں کے محافظ جگنو

نجم الاصغر کبھی ہرنوں کا لہو پینے سے
شیر کی ناف میں ہوتی نہیں پیدا خوشبو

جے۔ایم۔کوئٹزی/ ڈاکٹر شگفتہ حسین

وہ اور اُس کا ہم زاد

(نوبل لیکچر ۲۰۰۳ء)

لیکن مجھے اپنے نئے ساتھی کی طرف لوٹنا پڑا۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش تھا اور میں نے اس امر کو اپنی ذمہ داری بنالیا کہ میں اسے ہر وہ چیز سکھاؤں جو اُسے فائدہ مند، سبک دست اور کارآمد بنانے کے لیے مناسب ہو: بلکہ خصوصاً اسے اس قابل بنادے کہ وہ بات چیت کرنے لگے اور جب میں اس سے مخاطب ہوں تو وہ میری بات سمجھ سکے؛ اور وہ انتہائی سریع الفہم عالم تھا، جتنا کہ کبھی کوئی ہوگا۔ ڈینیل ڈیفو، روبنسن کروسو ــــــ بوسٹن، لنکن شائر کے ساحل پر واقع ایک خوبصورت قصبہ ہے، اس کا ہمزاد لکھتا ہے۔ پورے انگلستان میں سب سے بلند مینار والا چرچ یہیں پر واقع ہے؛ جہاز ران بحری سفر کے دوران اسی سے مدد لیتے ہیں۔ بوسٹن کے گرداگرد دلدلی (fen) علاقہ ہے۔ بگلے بکثرت ہیں، منحوس پرندے، جو بھاری کراہتی ہوئی آواز میں زور زور سے بولتے ہیں اور یہ آواز اتنی تیز اور بلند آہنگ ہوتی ہے کہ کسی بندوق کے چلنے کی آواز کی طرح، دو میل دَور تک سُنی جاسکتی ہے۔

دلدلیں (fens) دوسری قسموں کے پرندوں کا بھی گھر ہیں، اس کا ہمزاد لکھتا ہے، مرغابی اور جنگلی بطخ، پن ککڑی اور جنگلی بط، جنہیں دلدلی زمینوں پر رہنے والے آدمی پکڑ لیتے ہیں، دلدلی زمین کے آدمی، پالتو مرغابیوں کو پرورش کرتے ہیں، جنہیں وہ لاسا لگانے والی مرغابیاں یا Duckoys کہتے ہیں۔

دلدلیں مرطوب زمین کے قطعے ہیں۔ پورے یورپ میں، بلکہ پوری دنیا میں مرطوب بنجر زمین کے قطعے موجود ہیں، لیکن انہیں fens کا نام نہیں دیا گیا، fen انگریزی زبان کا لفظ ہے جو یہاں سے ہجرت نہیں کرے گا۔

اس کا ہمزاد لکھتا ہے کہ لنکن شائر کی یہ Duckoys تالابوں ☆ میں پرورش کی جاتی ہیں اور ہاتھ سے کھلا کھلا کر انہیں پالتو رکھا جاتا ہے۔ پھر جب موسم آتا ہے تو انہیں غیر ممالک، ہالینڈ اور جرمنی بھیجا جاتا ہے۔ ہالینڈ اور جرمنی میں یہ اپنی قسم کے دوسرے بھائی بندوں سے ملتی ہیں اور دیکھتی ہیں کہ ہالینڈ اور جرمنی کی مرغابیاں کیسی خستہ حالت میں زندہ ہیں، کیسے ان کے دریا موسم سرما میں جم جاتے ہیں اور ان کی زمینیں برف سے ڈھک جاتی ہیں، وہ انہیں یہ جانکاری دینے میں ناکام نہیں رہتیں، بلکہ اپنی مخصوص زبان میں انہیں یہ باور کرا دیتی ہیں کہ انگلستان میں جہاں سے وہ آئی ہیں، معاملہ قطعی بہ صورتِ دیگر ہے: انگریزی مرغابیوں کے پاس مقوی خوراک سے بھرے ساحل ہیں؛ کھاڑیوں میں آزادی سے بہتے جوار

☆ decoyPonds وہ تالاب جن میں لاسا لگا کر پکڑی جانے والی جنگلی بطخیں رکھی جاتی ہیں۔

بھاٹے ہیں؛ ان کے پاس جھیلیں ہیں، فوارے ہیں، کھلے تالاب اور محفوظ ڈھکے ہوئے تالاب ہیں؛ زمینیں بھی ہیں مکی سے بھری ہوئی، وہ مکی جو خوشہ چینوں سے پیچھے رہ جاتی ہے؛ اور وہاں کوئی پالا یا برف یا کہرا نہیں ہے۔

ان نقشوں سے، وہ لکھتا ہے، جو کہ بطخوں کی زبان میں کھینچے گئے ہیں، لاسا لگانے والی مرغابیاں یا duckoys پرندوں کی ایک کثیر تعداد کو جمع کر لیتی ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ، انہیں اغوا کر لیتی ہیں۔ وہ سمندروں کے پار ہالینڈ اور جرمنی سے ان کی رہنمائی کرتی ہیں اور لنکن شائر کی دلدلی زمینوں پر واقع اپنے جعلی تالابوں میں انہیں مقیم کر دیتی ہیں۔ اس سارے وقت میں وہ مسلسل ان سے اپنی زبان میں بط بط، بک بک کرتی رہتی ہیں اور انہیں بتاتی ہیں کہ یہی وہ تالاب ہیں جن کا انہوں نے ان سے ذکر کیا تھا اور جہاں وہ بخیر و عافیت اور بے غل و غش رہیں گی۔

اور جس وقت وہ اس قدر مصروف ہوتی ہیں، لاسا لگانے والے آدمی، لاسا لگانے والی مرغابیوں کے آقا، دھیرے دھیرے جھنڈ میں یا اپنی مخفی کمین گاہ میں جو انہوں نے دلدلوں کے اوپر سرکنڈوں سے بنائی ہوتی ہے، داخل ہوتے ہیں، اور نظروں میں آئے بنا سب کے سب پانی کے اوپر مٹھی بھر بھر مکی پھینکتے ہیں، لاسا لگانے والی مرغابیاں یا duckoys اپنے غیر ملکی مہمانوں کو اپنے پیچھے پیچھے لاتے ہوئے ان آدمیوں کے پیچھے چلتی رہتی ہیں۔ اور اس طرح اپنے مہمانوں کی رہنمائی کرتے اور سارا وقت انہیں یہ بتاتے کہ دیکھو انگلستان میں ہم سب کتنی اچھی زندگی بسر کرتی ہیں، دو یا تین دن کے اندر اندر، تنگ مزید تنگ ہوتے آبی راستوں کی طرف لاتے وہ انہیں ایسی جگہ لے آتی ہیں جہاں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جال پھیلے ہوتے ہیں۔

پھر فریبی آدمی اپنا فریبی کتا، جسے پرندوں کے پیچھے تیرنے کی مکمل ترین تربیت دی گئی ہے، باہر بھیجتے ہیں، وہ تیرتے ہوئے بھونکتا ہے۔ اس خوفناک مخلوق سے انتہائی دہشت زدہ ہو کر مرغابیاں اُڑتی ہیں، لیکن اوپر تنے جالوں سے مجبور ہو کر دوبارہ نیچے پانی میں آجاتی ہیں اور یوں گویا انہیں جال کے نیچے تیرنا ہے یا مرجانا ہے۔ لیکن جال تنگ سے تنگ اور تنگ سے تنگ ہوتا جاتا ہے ایک پرس کی طرح، اور پھر آخر میں کھڑے ہوتے ہیں لاسا لگانے والے آدمی، جو ایک ایک کر کے اپنے اسیروں کو پکڑ کر باہر نکال لیتے ہیں، وہ اپنی فریبی مرغابیوں کو سہلاتے ہیں، بہت اہمیت دیتے ہیں، لیکن جہاں تک ان کے مہمانوں کا تعلق ہے اُن کو موقع پر ہی ڈنڈا مار کر مار دیتے ہیں، پَر نوچتے ہیں اور سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں فروخت کر دیتے ہیں۔

کاغذ کے صفحے کے ساتھ ایک نیا مقابلہ شروع کرنے سے پہلے، اس کا ہمزاد ہر روز اپنے ننھے قلم تراش سے قلم کو تیز کرتا ہے اور خوش رواں لکھائی میں لنکن شائر کی یہ تمام خبریں تحریر کرتا ہے۔

ہیلی فیکس میں، اس کا ہمزاد لکھتا ہے، گردن اُڑا دینے والا ایک انجن تھا جو شاہ جیمز اوّل کے

عہد میں ہٹائے جانے تک یہی کام کرتا رہا۔ سزا یافتہ معتوب آدمی کو لٹا دیا جاتا جبکہ اس کا سر صلیب پر یا اونچے چبوترے پر رکھا جاتا؛ پھر جلاد ایک کیل کو جو بھاری بلیڈ کو اوپر اٹھائے ہوتی، ایک دھکے سے نکال دیتا۔ بلیڈ، ایک چرچ کے دروازے جتنا اونچا لمبا فریم، نیچے آتا اور قصائی کے چھرے کی طرح اس آدمی کا سر انتہائی صفائی سے کاٹ کر الگ کر دیتا۔

اگرچہ ہیلی فیکس کا دستور یہ تھا، کہ کیل کو دھکے سے نکالنے اور بلیڈ کے نیچے آنے کے وقفے میں اگر معتوب آدمی اپنے پاؤں پر اُچھل کر کھڑا ہو جائے اور دوبارہ جلاد کی گرفت میں آئے بنا پہاڑی سے نیچے دوڑ لگاتے، دریا پار تیرتا نکل جائے تو اُسے رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن ان تمام برسوں میں جن کے دوران یہ انجن ہیلی فیکس میں کھڑا رہا، ایسا واقعہ کبھی بھی رونما نہ ہوا۔

وہ (اب اس کا ہمزاد نہیں بلکہ وہ خود) برسٹل میں لبِ دریا واقع اپنے کمرے میں بیٹھتا ہے اور یہ روداد پڑھتا ہے۔ اس کی عمر کے سال بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اب تقریباً ایک بوڑھا آدمی ہے۔ سایہ کے لیے چھوٹی یا بڑی کھجور کے پتوں سے چھتری بنانے سے پہلے ہی اس کے چہرے کی جلد جو تیز دھوپ کی وجہ سے تقریباً کالی ہو چکی تھی، اب نسبتاً زردی مائل ہے، گو ابھی تک چرمی کاغذ جیسی سخت کھردری ہے؛ اس کی ناک پر تیز دھوپ سے بننے والا چھلا ہوا زخم ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوگا۔

چھتری ابھی تک اس کے پاس ہے، اس کے کمرے میں ایک کونے میں رکھی ہوئی، لیکن طوطا جو اس کے ساتھ واپس آیا تھا، فوت ہو چکا ہے۔ ''بے چارہ روبن''! طوطا اس کے کندھے پر اپنی مخصوص جگہ بیٹھے بیٹھے پکارے جاتا، ''بے چارہ روبن کروسو! غریب روبن کو کون بچائے گا؟'' اس کی بیوی طوطے کا یہ باقاعدگی سے جاری نالہ وشیون، ''بے چارہ روبن، بے چارہ روبن'' برداشت نہ کر سکتی۔ وہ کہتی، ''میں اس کی گردن مروڑ دوں گی''، لیکن اس میں ایسا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

جب وہ اپنے جزیرے سے اپنے طوطے اور اپنی چھتری اور خزانے سے بھرے اپنے بڑے سارے صندوق کے ساتھ انگلستان واپس آیا تو کچھ عرصہ تو وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس جاگیر پر کافی سکون اور آرام سے بسر کرتا رہا، جو اس نے ہن ٹنگ ڈن میں خریدی تھی، کیونکہ وہ ایک دولت مند آدمی بن گیا تھا، اور اپنی مہمات کی کتاب کی اشاعت کے بعد تو اور بھی امیر سے امیر تر ہوتا چلا گیا تھا۔ لیکن وہ سال جو اس نے جزیرے میں گزارے تھے، اور پھر وہ سال جو اس نے اپنے ملازم فرائیڈے کے ساتھ سفر میں بسر کیے تھے (''بے چارہ فرائیڈے''! وہ خود سے افسوس کرتا، ٹیں، ٹیں، کیونکہ طوطا سوائے اس کے نام کے فرائیڈے کا نام کبھی نہ لیتا) ان سالوں نے ایک مہذب جاگیردار کی زندگی کے انداز و اطوار کو اس کے لیے بے رنگ بنا دیا تھا۔ اور اگر سچ بتایا جائے تو ازدواجی زندگی بھی ایک زخم خوردہ مایوسی تھی۔ وہ گوشۂ عافیت کی تلاش میں ہر دن خود کو زیادہ سے زیادہ، اپنے گھوڑوں کے پاس، اصطبل میں پاتا، جو خوش قسمتی سے بک بک نہیں کرتے تھے، بلکہ جب وہ آتا تو ملائمت اور آہستگی سے ہنہناتے، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ

جانتے ہیں کہ وہ کون ہے، اور پھر دوبارہ خاموشی اختیار کر لیتے۔

اپنے جزیرے سے آنے کے بعد، جہاں فرائیڈے کے پہنچنے سے پہلے تک وہ ایک خاموش زندگی گزار رہا تھا، اُسے ایسا لگتا جیسے دنیا قوتِ گویائی سے بھری ہوئی ہے۔ بستر میں اپنی بیوی کے برابر لیٹے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کھڑکھڑاہٹ اور بھڑبھڑاہٹ کی صورت اس کے سر پر کنکروں کا مینہ برسا دیا گیا ہے، جب کہ اس کی خواہش صرف یہ ہوتی کہ وہ سو جائے اور بس!

اسی لیے جب اس کی بوڑھی بیوی نے اپنے وجود کے بھوت کو چھوڑا تو اس نے سوگ تو منایا، لیکن اُسے افسوس نہیں ہوا۔ اس نے اس کی تجہیز و تکفین کی اور ایک معقول وقفے کے بعد ہنٹنگ ڈن میں جاگیر کا انتظام اپنے بیٹے کے سپرد کر کے، برسٹل میں دریا کے سامنے واقع ''دی جولی تار'' میں یہ کمرہ حاصل کر لیا، وہ اپنے ساتھ صرف جزیرے سے لائی چھتری، جس نے اسے خاصا مشہور کر دیا تھا، اور مردہ طوطا جو اپنی چھتری پر جما بیٹھا تھا اور چند ایک ضرورت کی چیزیں لایا تھا اور تب سے اب تک، اپنے پائپ پیتے، سمندر کے پار دور مغرب کی سمت ٹکٹکی باندھے تکتے ہوئے، کہ اس کی بینائی اب بھی بڑی تیز ہے، دن میں گھاٹوں اور پانی پر بنے پشتوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے، وہ یہاں اکیلا رہ رہا ہے۔ جہاں تک اس کے کھانا کھانے کا تعلق ہے تو وہ وقت کے وقت اپنا کھانا اپنے کمرے میں لے آتا ہے؛ کیونکہ جزیرے پر تنہائی کا عادی ہونے کے سبب اُسے لوگوں کی صحبت میں کوئی مزہ نہیں آتا۔

وہ مطالعہ نہیں کرتا، وہ اس کے لیے ذوق کھو بیٹھا ہے؛ لیکن اپنی مہمات تحریر کرنے کے عمل نے اسے لکھنے کی عادت ڈال دی ہے، یہ ایک کافی خوشگوار تفریح ہے۔ شام ہوگی تو شمع کی روشنی میں وہ اپنے کاغذ نکالے گا اور اپنے قلموں کو تراش کر خوب تیز کرے گا اور اپنے ہمزاد کے ایک یا دو صفحے تحریر کرے گا، اس ہمزاد کے جو لنکن شائر کی duckoys کی، اور ہیلی فیکس کے موت کے انجن کی رپورٹ بھیجتا ہے کہ خوفناک بلیڈ کے نیچے آنے سے پہلے اگر کوئی اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے اور پہاڑی سے نیچے دوڑ لگا دے تو بچ سکتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی دوسری چیزوں کی خبریں۔ ہر جگہ جہاں وہ جاتا ہے، وہاں سے رپورٹ بھیجتا ہے، کیونکہ یہ اس کا اوّلین کام ہے، کس قدر مصروف ہمزاد ہے اس کا!

بندرگاہ کی دیوار کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، ہیلی فیکس کے انجن کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ، روبن، جسے طوطا ''بے چارہ روبن'' کہہ کر پکارتا تھا، ایک کنکر پھینکتا ہے اور سنتا ہے، ایک سیکنڈ بلکہ ایک سیکنڈ سے بھی کم، اس سے پہلے کہ کنکر پانی سے ٹکراتا ہے۔ خدا کی رحمت بہت تیز رفتار ہے، لیکن کیا سخت فولاد کا بنا عظیم بلیڈ، ایک کنکر سے زیادہ بھاری ہونے اور چربی سے چکنا ہونے کے سبب زیادہ تیز رفتار نہیں ہو سکتا؟ ہم اس سے کبھی کیسے بچ سکیں گے؟ اور وہ آخر کس نوع کا آدمی ہو سکتا ہے جو ایک مصروفیت کے عالم میں بادشاہ کی قلمرو میں، تیزی سے ادھر سے ادھر موت کے ایک تماشے سے دوسرے تماشے (ڈنڈا مار کر مار دینا، سر قلم کر دینا) کی طرف آئے جائے گا؛ ایک کے بعد ایک رپورٹیں

بھیجتا رہے گا؟

ایک کاروباری آدمی، وہ اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایک کاروباری آدمی ہے، کہہ سکتے ہیں کہ؛ ایک غلے کا تاجر یا ایک چمڑے کا تاجر، یا ایک کاریگر اور چھت کی ٹائلیں فراہم کرنے والا، کسی ایسی جگہ کا جہاں مٹی بکثرت ہوتی ہے، چلئے جگہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ ''ویپنگ'' کا جو اپنی تجارت کے مفاد میں بیشتر سفر میں رہتا ہے۔ اسے خوشحال بنا دیں، اسے ایک عدد بیوی دے دیں جو اس سے محبت کرتی ہے اور باتونی تو بالکل نہیں ہے اور اس کے لیے بچے پیدا کرتی ہے، زیادہ تر بیٹیاں، اسے معقول خوشی فراہم کریں؛ پھر اچانک اس کی خوشی کو ختم کر دیں۔ ایک موسمِ سرما میں ٹیمز چڑھائی کرتا ہے، بھٹیاں جن میں ٹائلیز پکائی جاتی ہیں، یا غلے کے گودام یا چمڑے سے بنی مصنوعات، پانی میں بہہ جاتی ہیں، وہ، اس کا ہمزاد، تباہ ہو گیا ہے، قرض خواہ مکھیوں یا کووں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، وہ اپنے گھر، اپنی بیوی، اپنے بچوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور بھیس بدل ایک جعلی نام اپنائے بھکاریوں کی لین میں سب سے زیادہ تباہ حال کوارٹروں میں سے ایک میں چھپ جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ___ پانی کی موج، تباہی، روپوشی، پیسے پیسے کی محتاجی، چیتھڑے، تنہائی ___ آیئے ان سب حالات کو جہاز کی تباہی اور جزیرہ تصور کر لیتے ہیں جہاں وہ بے چارہ روبن، چھبیس سال دنیا بھر سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتا رہا، حتیٰ کہ وہ تقریباً پاگل ہو گیا (واقعی بھئی! کون ہے جو کہہ سکتا ہے کہ کسی حد تک ہی سہی، وہ پاگل نہیں ہوا؟)

اور یا پھر فرض کر لیں کہ وہ آدمی ایک زین ساز ہے جس کا ''وائٹ چیپل'' میں ایک گھر اور ایک دکان اور ایک مال خانہ ہے، اور اس کی ٹھوڑی پر ایک سیاہ تل ہے اور اس کی ایک بیوی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے اور باتونی نہیں اور اس کے لیے بچے پیدا کرتی ہے، زیادہ تر بیٹیاں، اور اسے ڈھیر ساری خوشی فراہم کرتی ہے، یہاں تک کہ شہر میں طاعون پھیل جاتا ہے، یہ ۱۶۶۵ء کا سال ہے، ابھی لندن میں لگنے والی تباہ کن آگ کا زمانہ نہیں آیا، طاعون لندن پر نازل ہوتا ہے: ہر روز، ایک کے بعد ایک Parish ☆ مردوں کے انباروں کی گنتی، امیر اور غریب، کیونکہ طاعون درجات کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا ہے، اس زین ساز کی ساری دنیاوی دولت بھی اسے بچا نہیں سکے گی۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کو دیہات میں بھیج دیتا ہے اور خود بھی فرار کا منصوبہ بناتا ہے، لیکن پھر فرار نہیں ہوتا۔ ''نہ ڈرو اس دہشت سے جو رات کو ہوتی ہے''، اس خطرے کے موقع پر وہ بائبل کھولتا ہے اور پڑھتا ہے، ''نہ ڈرو اس تیر سے جو دن کو اُڑتا ہے؛ نہ اس وباء سے جو تاریکی میں چلتی ہے؛ نہ اس تباہی سے جو دوپہر کو بربادی پھیلاتی ہے؛ یہ بلائیں تمہارے ایک طرف ایک ہزار گریں گی اور دس ہزار تمہارے دائیں ہاتھ کی طرف، لیکن یہ تمہارے

☆ Parish ایسا ضلع جس کا اپنا گرجا اور اپنا پادری ہوتا ہے۔

نزدیک نہیں آئیں گی۔''

سو وہ، اس علامت سے کہ، یہ علامت ہے محفوظ راستے کی، ہمت پکڑتا ہے، وہ متاثرہ لندن میں ہی رُکا رہتا ہے اور رپورٹیں لکھتا رہتا ہے۔ میرا گلی میں ایک ہجوم سے سامنا ہوا، وہ لکھتا ہے، اور ایک عورت ان کے درمیان آسمانوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی، ''دیکھو'' وہ چلاتی ہے، ''ایک فرشتہ، سفید لباس میں ملبوس، شعلوں میں لپٹی ایک تلوار گھما رہا ہے''! اور سارا ہجوم ایک دوسرے کی طرف اثبات میں سر ہلاتا ہے، ''ارے واقعی یہ تو ایسا ہی ہے''، وہ کہتے ہیں، ''ایک فرشتہ تلوار تھامے ہوئے!'' لیکن اُسے، زین ساز کو، کوئی فرشتہ، کوئی تلوار دکھائی نہیں دیتی ہے۔ جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے وہ عجیب وغریب ہیت کا ایک بادل ہے، سورج کی چمک کی وجہ سے جس کا ایک کنارہ دوسرے کنارے سے زیادہ روشن ہے۔ ''یہ ایک تمثیل ہے''! گلی میں عورت چلاتی ہے؛ لیکن اسے اپنی زندگی کے لیے کوئی تمثیل دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اسی طرح اس کی رپورٹ میں لکھا ہے۔

ایک اور دن، ''ویپنگ'' میں دریا کنارے ٹہلتے ہوئے، اس کا ہمزاد، جو ایک زین ساز ہوا کرتا تھا، لیکن اب اس کا کوئی کاروبار نہیں رہا، مشاہدہ کرتا ہے کہ کیسے ایک عورت اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ایک آدمی کو پکارتی ہے، جو چیتھڑے پہنے اونچی بغلوں والی کشتی کھے رہا ہے: ''رابرٹ! رابرٹ!'' وہ پکارتی ہے؛ اور پھر کیسے وہ آدمی کشتی کو ساحل کی طرف لاتا ہے، کشتی سے ایک بورا اُٹھاتا ہے، جسے وہ لبِ دریا ایک پتھر پر رکھ دیتا ہے اور دوبارہ کشتی چلانے لگتا ہے؛ پھر کیسے وہ عورت دریا کنارے آتی ہے اور بورا اُٹھاتی ہے، پھر بہت رنجیدہ صورت بنائے، گھر لے جاتی ہے۔

وہ اس آدمی رابرٹ کو آواز دے کر روکتا ہے اور اس سے بات کرتا ہے۔ رابرٹ اس کو آگاہ کرتا ہے کہ عورت اس کی بیوی ہے اور بورے میں اس کے اور بچوں کے لیے ہفتے بھر کا راشن ہے، گوشت، پسا ہوا غلہ، دالیں اور مکھن وغیرہ؛ لیکن وہ ان کے نزدیک جانے کی ہمت نہیں رکھتا کیونکہ ان سب کو، اس کی بیوی اور بچوں کو، طاعون کی گلٹی نکل آئی ہے؛ اور یہ کہ یہ بات اس کا دل توڑ دیتی ہے۔ اور یہ سب کچھ ہے ___ اس کے علاوہ، آدمی رابرٹ اور اس کی بیوی پانی کے آر پار ایک دوسرے کو پکارتے اور یوں آپس میں رابطہ رکھتے ہیں، لبِ دریا چھوڑا ہوا بورا ___ بورے کے اپنے ہونے کی دلیل تو یقیناً ہے، لیکن یہ خود اس کے اپنے ہونے کی بھی علامت ہے، روبنسن کی، اپنے جزیرے پر تنہائی کی، جہاں گھور اندھیرے میں ڈوبی مایوسی کے بھیانک لمحوں میں اس نے لہروں کے پار انگلستان میں موجود اپنے پیاروں کو پکارا تھا کہ اُسے بچا لیں، جبکہ دوسرے وقت میں وہ کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں تیرتا ہوا ٹوٹے پھوٹے جہاز کی طرف گیا تھا۔ اس آفت کے لمحوں کی مزید رپورٹ یہ ہے۔ درد جو جانگھ اور بغلوں میں ہونے والی سوجن سے ہو رہا تھا اسے مزید برداشت نہ کر سکتے ہوئے کہ یہ طاعون کی علامت ہے، ایک آدمی مادر زاد برہنہ گلی میں چیختا چلاتا بھاگتا ہے، ''وائٹ چیپل'' میں ''ہیرووایلی'' میں جہاں اس کا ہم زاد،

زین ساز، اس آدمی کو اُچھلتے کودتے اور ہزار ہا عجیب وغریب حرکات کرتے دیکھتا ہے، اس کی بیوی اور بچے روتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور پکارتے ہیں، واپس آ جاؤ، واپس آ جاؤ۔ اور اس آدمی کی اُچھل کود، خود اس کی اپنی اُچھل کود کی تمثیل ہے، جب جہاز تباہ ہونے کی بپتا پڑنے کے بعد، اس نے اپنے جہازی ساتھیوں کی تلاش میں ساحل سمندر چھان مارا اور کسی کو نہ پایا، سوائے ایک جوڑا جوتوں کے، جو اس کے دوست اس کے ساتھی نہیں تھے، اسے سمجھ میں آ گیا کہ اسے یکہ وتنہا ایک وحشی جزیرے پر نکال باہر کر دیا گیا ہے، قرینِ قیاس یہی تھا کہ نجات کی کوئی اُمید دیئے بغیر اسے ہلاکت میں ڈال دیا گیا تھا۔

(لیکن وہ اور کیا چپکے چپکے گنگناتا ہے علاوہ اپنی تنہائی اور غم کے؟ اس نے خود سے حیران ہوتے ہوئے سوچا، یہ بے چارہ آزار میں مبتلا آدمی جس کے بارے میں وہ پڑھتا ہے، اپنے اندر کی جلن سے بے قرار ہو کر وہ پانیوں کے پار برسوں کے پار کیا پکارتا ہے؟؟)

ایک سال پہلے، اس نے، روبنسن نے، ایک طوطا خریدنے کے لیے ایک ملاح کو دو گینیز دیئے، جس کے بارے میں ملاح نے کہا تھا کہ وہ اُسے برازیل سے لایا ہے، ایک پرندہ جو اتنا شاندار تو نہیں تھا جیسا کہ اس کا اپنا پیارا طوطا، لیکن پھر بھی اپنے سبز پروں اور ایک پیاری سرخ کلغی کے ساتھ کچھ کم شاندار نہیں تھا اور اگر ملاح کا اعتبار کیا جا سکتا تو وہ زبردست باتیں کرنے والا پرندہ تھا۔ اور واقعی وہ پرندہ سرائے میں واقع اس کے کمرے میں اپنی چھتری پر بیٹھتا، اس کی ٹانگ سے ایک چھوٹی سی زنجیر بندھی رہتی، تاکہ اگر وہ اُڑ کر دُور جانے کی کوشش کرے تو جا نہ سکے، وہ یہ الفاظ کہتا، ''بے چارہ پال! بے چارہ پال!'' بار بار، یہاں تک کہ وہ اس کا چہرہ ڈھانپنے پر مجبور ہو جاتا؛ لیکن بولنے کے لیے اُسے کوئی اور لفظ نہ سکھایا جا سکا، مثلاً ''بے چارہ روبن''! شاید یہ سیکھنے کے لیے وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔

بے چارہ پال، تنگ کھڑکی میں سے مستولوں کے سروں کے اوپر سے، اور مستولوں کے سروں سے بھی دور پرے، سرمئی اٹلانٹک کے اُبھار کے پار ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے: ''یہ کون سا جزیرہ ہے''، بے چارہ پال پوچھتا ہے، ''اتنا سرد، اتنا بے کیف، اتنا افسردہ، جہاں مجھے نکال باہر کیا گیا ہے؟ میرے مصیبت کے لمحات میں تم کہاں ہو؟ میرے نجات دہندہ، کہاں ہو؟''

ایک آدمی شراب کے نشے میں دُھت اور انتہائی رات گئے ہونے کی وجہ سے (اس کے ہمزاد کی ایک اور رپورٹ) ''کرپل گیٹ'' کے آمدورفت کے دروازے پر گہری نیند سو جاتا ہے، مردہ گاڑی اپنے راستے پر آتی ہے، (ہم ہنوز طاعون کے سال میں ہیں) اور پڑوسی یہ سوچتے ہوئے کہ وہ آدمی مردہ ہے اسے لاشوں کے درمیان مردہ گاڑی پر رکھ دیتے ہیں۔ ہوتے ہوتے گاڑی ''ماؤنٹ مل'' میں کھودے ہوئے مردوں کے گڑھے تک آتی ہے اور گاڑی بان، جس کا چہرہ زہریلے بدبودار بھپکوں سے بچنے کے لیے پورا ڈھکا ہوا ہے، اس پر گرفت کرتا ہے تاکہ اُسے اُٹھا کر گڑھے کے اندر پھینک دے؛ اور تب وہ جاگ اُٹھتا ہے اور اپنی حیرت میں خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے ''میں کہاں ہوں؟'' وہ کہتا ہے۔

''تم مردوں کے درمیان تقریباً دفن ہونے والے ہو'' گاڑی بان کہتا ہے۔ ''لیکن تب کیا میں مر چکا ہوں؟'' آدمی کہتا ہے۔ اور یہ بھی اپنے جزیرے پر اسی کا ہیولا ہے۔

لندن کے رہنے والے کچھ لوگ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ صحت مند ہیں اور اس وبا سے بچ نکلیں گے، اپنا کاروبار جاری رکھتے ہیں، لیکن مخفی طور پر وہ اپنے خون میں طاعون رکھتے ہیں: اس کا ہم زاد یہ رپورٹ دیتا ہے، جب چھوت کے جراثیم ان کے دل تک پہنچتے ہیں تو وہ موقع پر ہی گر کر ہلاک ہو جاتے ہیں، ایسے جیسے ان پر آسمانی بجلی گری ہو۔ اور یہ خود زندگی کے لیے ایک علامت ہے، پوری زندگی کے لیے۔ لازمی تیاری۔ ہمیں موت کے لیے لازمی تیاری کر لینی چاہیے یا پھر ہم جہاں کھڑے ہوں وہیں ڈھیر ہو جائیں۔ جیسا کہ اُسے، روبنسن کو، دکھایا گیا، جب ایک دن، اچانک، اس نے اپنے جزیرے میں، ریت پر ایک آدمی کے پاؤں کا نشان دیکھا۔ یہ ایک نقش تھا اور اس لیے ایک علامت تھا: ایک پاؤں کی؛ ایک آدمی کی۔ لیکن یہ اس سے بھی کہیں زیادہ کی علامت تھا۔ ''تم تنہا نہیں ہو''، علامت نے کہا: اور یہ بھی، ''قطع نظر اس سے کہ تم سمندر میں کتنی دُور نکل جاؤ، کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کہیں چھپ جاؤ، تمہیں ڈھونڈ نکالا جائے گا۔''

طاعون کے دنوں میں، اس کا ہمزاد لکھتا ہے، دوسروں نے، خوف اور دہشت کے سبب سب کچھ چھوڑ دیا، اپنے گھر، اپنی بیویاں، اپنے بچے، اور لندن سے دُور جہاں تک بھاگ سکتے تھے، بھاگ نکلے۔ جب طاعون ختم ہو گیا، تو ہر جگہ ان کے فرار کو بزدلی قرار دے کر لعنت ملامت کی گئی۔ لیکن، اس کا ہمزاد لکھتا ہے، ہم بھول جاتے ہیں کہ طاعون کا سامنا کرنے کے لیے ہمت وحوصلے کی کون سی قسم درکار تھی۔ یہ صرف کسی سپاہی کا حوصلہ نہ تھا، کہ ہتھیار پکڑ کر دشمن پر ہلا بول دو: یہ اپنے زرد گھوڑے پر سوار ''موت'' پر ہلا بولنے کے مترادف تھا۔

اس کا جزیرے والا طوطا، دونوں میں سے جس سے نسبتاً زیادہ پیار کیا گیا، اپنی بہترین صلاحیتوں کے باوجود بھی کوئی ایسا لفظ نہ بولتا جو اسے اس کے آقا نے نہ سکھایا ہو۔ تب پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ یہ اس کا ہمزاد، جو طوطے ہی کی ایک قسم ہے اور جس سے زیادہ پیار بھی نہیں کیا گیا، اپنے آقا جیسا یا اس سے بہتر لکھتا ہے۔ یہ اس کا ہمزاد، بلاشبہ ایک اچھے قابل قلم کو بروئے کار لاتا ہے۔ ''اپنے زرد گھوڑے پر سوار 'موت' پر ہلا بولنے کے مترادف ہے۔'' اس کی اپنی مہارت جو اس نے محاسب خانہ سے حاصل کی تھی، صرف قرضوں اور روپے پیسے کا حساب رکھنے تک محدود تھی، جملوں کو ترتیب دینا یا تحریر کرنا اُسے نہیں آتا تھا۔ ''اپنے زرد گھوڑے پر کار موت کو'': وہ لفظ ہیں جو وہ سوچ بھی نہ سکتا، لیکن صرف جب وہ خود کو اپنے ہمزاد کے حوالے کر دیتا تو تب ایسے الفاظ دماغ میں آتے۔

اور لاسا لگانے والی مرغابیاں یا duckoys: وہ روبنسن، جعلی مرغابیوں کے بارے میں کیا جانتا تھا؟ جب تک اس کے ہمزاد نے رپورٹیں بھیجنا شروع نہ کیں ____ وہ کچھ بھی تو نہ جانتا تھا!

لنکن شائر کی دلدلی زمینوں کی duckoys، ہیلی فیکس کا گردن اُڑا دینے والا عظیم الجثہ انجن:
ایسا لگتا جیسے اس کا ہمزاد وسیع دورے کے بعد برطانوی جزیرے کی رپورٹیں بھیجتا ہے، جو ایک اعتبار سے اس وسیع دورے کی علامت ہے، جو وہ چپو سے کھینے والی اپنے ہاتھوں سے بنائی کشتی میں بیٹھ کر اپنے جزیرے کا کیا کرتا تھا، وہ دورہ جس نے اس پر واضح کیا کہ دُور پرے اس جزیرے کا ناہموار، تاریک اور ناموافق دوسرا کنارہ موجود ہے، بعد میں اس نے ہمیشہ اس طرف جانے سے گریز کیا، گو کہ، اگر مستقبل میں نوآبادکار اس جزیرے پر پہنچیں گے تو وہ اس کا تفصیلی دورہ کر کے اس کو آباد کر دیں گے؛ یہ بھی ہماری روح کے تاریک اور روشن رُخ کی ایک علامت ہے۔

جب چربہ سازوں، دوسروں کی تخلیقات کو چرانے والوں اور نقالوں کے اوّلین جتھے اس کے جزیرے کی تاریخ پر ٹوٹ پڑے اور لوگوں کو اپنی گھڑی ہوئی مکروفریب کی کہانیاں سنا کر، کہ کیسے ان کا جہاز تباہ و برباد ہو گیا اور انہوں نے جزیرے پر کیسی زندگی گزاری، گندم نما جوفروشی کرنے لگے، تو اسے ایسا لگا کہ یہ آدم خوروں کے جتھے سے کم نہیں جو اس کا گوشت کھانے کے لیے اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی زندگی ختم کرنے کے درپے ہیں؛ اور اسی لیے اسے یہ کہنے میں ذرا بھر تامل نہ ہوا کہ، ''جب میں نے ان آدم خوروں کے خلاف اپنا دفاع کیا جو مجھے نیچے گرانے اور بھوننے اور نگلنے کے متلاشی تھے''، اس نے لکھا، ''میں سوچتا ہوں کہ میں نے اس ''خاص چیز''، کے خلاف اپنا دفاع کیا''۔ ''جس کا قیاس کرنا مشکل تھا''، اس نے لکھا، ''مگر یہ آدم خور ایک بہت ہی زیادہ، بے تحاشا شیطنت کی علامتیں تھے، جو اصل سچائی کے مادے کو کُتر کُتر کر ختم کر دیتے۔'' لیکن اب مزید سوچ بچار سے، اپنے نقالوں کے لیے اس کے سینے میں یہ احساس رینگنے لگتا ہے کہ وہ بھی اسی جیسے ہیں، کیونکہ اب اسے ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں بس ایک مٹھی بھر کہانیاں ہیں؛ اور اگر جوانوں کو بوڑھوں کا پیچھا لینے سے منع کر دیں تو پھر تو انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو کر بیٹھ جانا چاہیے۔

اسی طرح اپنے جزیرے کی مہمات کے بیان میں وہ بتاتا ہے کہ کیسے ایک رات وہ خوفزدہ ہو کر جاگ اُٹھا یہ یقین رکھتے ہوئے کہ شیطان ایک بہت بڑے کتے کی شکل میں اس کے بستر میں اس پر سوار تھا۔ پس وہ اُچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور جہازیوں کے استعمال میں آنے والی چھوٹی خمدار تلوار ہاتھ میں لیے دائیں بائیں ہوا کو چیرتے اپنا دفاع کرنے لگا جبکہ بے چارہ طوطا جو اس کے پلنگ کے ساتھ سویا ہوا تھا، وہ خطرے کا احساس کر کے چیخنے چلانے لگا۔ صرف کئی دِنوں کے بعد ہی اسے یہ سمجھ میں آیا کہ نہ تو کتا اور نہ ہی شیطان اس پر سوار ہوا تھا، بلکہ وہ ایک قسم کے فالج کا شکار ہوا تھا، فالج جو وقتی طور پر ہوا اور ختم ہو گیا اور چونکہ وہ اپنی ٹانگ کو حرکت دینے کے قابل نہ تھا اس لیے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ کوئی جانور پھیلا ہوا اس پر لدا تھا۔ اس واقعے سے لگتا ہے کہ یہ سبق ملتا ہے، تمام بیماریاں مع فالج شیطان کی طرف سے آتی ہیں اور بہت ہی شیطانی ہوتی ہیں؛ کہ بیماری کے نازل ہونے کو شیطان کا ورود تصور کیا جا سکتا

ہے، یا ایک کتے کا ورود شیطان کی نمائندگی ہے، لیکن یہ سب اس کا وہم تھا، جیسا کہ زین ساز کی طاعون کی تاریخ میں بھی یہ بیماری ہی تھی؛ اور اسی لیے جو کوئی بھی شیطان کی یا طاعون کی کہانیاں لکھتا ہے، اسے یک قلم ایک جعل ساز یا ایک چور کی حیثیت سے ردّ نہیں کر دینا چاہیے۔

جب برسوں پہلے، اس نے اپنے جزیرے کی کہانی لکھنے کی ٹھانی، تب اس پر منکشف ہوا کہ لفظ اس پر اُترنے سے انکاری تھے، اس کا قلم رواں ہونے سے عاری تھا، جبکہ اس کی انگلیاں سخت اور ڈھلمل متامل تھیں، لیکن پھر دن بہ دن، قدم بہ قدم، اس نے لکھنے کے کام میں پکی مہارت حاصل کر لی، یہاں تک کہ جب فرائیڈے کے ساتھ منجمد شمالی میں اس کی مہمات کا وقت آیا تو صفحے کے صفحے بھرے جانے لگے بلکہ یہ کہیے کہ بغیر سوچے سمجھے، قلم برداشتہ!

افسوس! سہولت کے ساتھ تحریر کرنے کی وہ پرانی ادا اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ جب وہ برسٹل کی بندگارہ سے پرے دیکھتے ہوئے، کھڑکی کے سامنے لکھنے کے چھوٹے ڈیسک پر بیٹھتا ہے تو اس کا ہاتھ بوجھل اور قلم ایسا اجنبی، کسی دوسرے دیس کا آلہ محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے کبھی تھا۔

کیا وہ، دوسرا بندہ، اس کا ہمزاد، لکھنے کے کام کو نسبتاً آسان پاتا ہے؟ وہ کہانیاں جو وہ مرغابیوں اور موت کی مشینوں اور طاعون زدہ لندن کے بارے میں لکھتا ہے، ان میں بڑی روانی اور بہاؤ ہے، لیکن تب کبھی اس کی اپنی کہانیاں بھی ایسی ہی رواں تھیں۔ شاید وہ اس چھوٹے خوش وضع پھرتیلے آدمی کے بارے میں، جو تیز قدم ہے اور جس کی ٹھوڑی پر سیاہ تل ہے، غلط اندازہ لگاتا ہے۔ شاید اس ایک لمحے، وہ اس وسیع سلطنت میں کہیں کسی جگہ، کرائے پر لیے ہوئے ایک کمرے میں تنہا بیٹھتا ہے، اور قلم کو سیاہی میں ڈبوتا ہے، پھر دوبارہ ڈبوتا ہے تو وہ شکوک، ہچکچاہٹ اور متامل خیالات سے بھرا ہوتا ہے۔

ان کو کیا متصور کیا جا سکتا ہے، اسے اور اس کے ہمزاد کو؟؟ کیا جیسے آقا اور غلام؟ جیسے بھائی، جڑواں بھائی؟ جیسے فوج میں کامریڈز؟ یا جیسے دشمن، حریف؟ وہ اس بے نام ساتھی کو کیا نام دے گا جس کے ساتھ مل کر وہ اپنی شامیں گزارتا ہے اور کبھی کبھی تو راتیں بھی، جو صرف دن کے وقت غیر حاضر ہوتا ہے، جب وہ روبن، پانی کے پشتوں پر چہل قدمی کرتے نو واردوں کا جائزہ لیتا ہے، اور اس کا ہمزاد سلطنت میں گھوڑا دوڑاتے اپنے جائزے لیتا ہے؟

کیا اس کا ہم زاد، اپنے سفر کے راستے میں کبھی برسٹل بھی آئے گا؟ وہ اس شخص سے مجسم حالت میں ملنے، اس سے مصافحہ کرنے، پشتوں کے کنارے اس کے ساتھ مل کر ٹہلنے اور وہ سب سننے کا مشتاق ہے جو وہ جزیرے کے تاریک شمال میں کئے جانے والے اپنے دورے کے بارے میں بتاتا ہے، یا اس کی ان مہمات کے بارے میں سننا چاہتا ہے جو اسے لکھنے کے کام میں پیش آئیں۔ لیکن وہ ڈرتا ہے کہ اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوگی، کم از کم اس زندگی میں تو نہیں۔ اگر وہ اپنے اور اپنے ہم زاد، دونوں کے جوڑے کے درمیان مماثلت تلاش کر بھی لے تو وہ لکھے گا کہ وہ دو بحری جہازوں کی طرح ہیں جو مخالف

سمتوں میں سفر کر رہے ہیں، ایک مغرب کی سمت تو دوسرا مشرق کی۔ یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ، وہ عرشے پر صفائی وغیرہ کا کام کرنے والے مزدور ہیں، جو جہاز کی طنابیں لگانے کے سخت محنت طلب کام میں مصروف ہیں، ایک مغرب کی سمت سفر کرتے جہاز پر سوار ہے تو دوسرا مشرق کی سمت سفر کرنے والے پر۔ ان کے جہاز ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہیں، اتنے قریب سے کہ وہ ایک دوسرے کو پکار لیں۔ لیکن سمندر طوفانی ہیں، موسم تیز جھکڑ والا ہے: پانی کی بوچھاڑ ان کی آنکھوں پر کوڑے برساتی ہے، ان کے ہاتھ جہاز کے رسوں سے جلتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہیں، لیکن اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ ایک دوسرے کو ہاتھ بھی نہیں ہلاتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عقیلہ بشیر

جب دروازہ کھلا

پروفیسر نے جب آخری ہچکی لی تو اُس کی بیوی نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کا سر آہستگی سے اپنی گود سے اُٹھا کر چارپائی پر رکھا، تکیہ نام کی کوئی چیز چوں کہ چارپائی پر موجود نہ تھی لہٰذا اُسے سر اور گردن کے نیچے سے نکالنے کی زحمت نہ کرنی پڑی۔ بیوہ عورتوں کی مانند جب اُس نے چیخنا چاہا تو خشک گلے میں سے آواز نہ نکل سکی اور جب اس نے اپنی آنکھوں کو پونچھنا چاہا تو یک دم یہ تکلیف دہ احساس پیدا ہوا کہ اُس میں آنسو بہانے کی بھی سکت نہیں۔ آنسو بھی شاید تب نکلتے ہیں جب جسم میں پانی موجود ہو اور دو دِن سے وہ اپنے بیمار شوہر کا سر گود میں لیے بیٹھی تھی۔ کھانے کے لیے تو ویسے بھی گھر میں کچھ موجود نہ تھا جسے نگلنے کے لیے پانی کی ضرورت محسوس ہوتی۔ دو دن سے اس کی نظریں اپنے شوہر کے چہرے پر جمی تھیں اور اَب جب اس نے شوہر کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کو موندھنا چاہا تو باوجود کوشش کے وہ اُنہیں ایک لمحے کے لیے بھی جھپک نہ سکی۔ بمشکل کھڑے ہو کر اس نے رضائی کے نام پر پرانا چیتھڑا اپنے محبوب شوہر کے جسم پر ڈال کر اچھی طرح ڈھانپ دیا اور چارپائی سے نیچے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئی اور اپنا ماتھا شوہر کے قدموں میں رکھ دیا۔ بہت سال پہلے جب اُس کا شوہر پہلی مرتبہ اُس سے روٹھا تھا تو اُس نے اُسے اِسی طرح منایا تھا بغیر ایک لفظ کہے وہ اِسی طرح اُس کے قدموں میں جھک گئی تھی۔ وہ شاید پہلی اور آخری بار تھا جب وہ اس سے روٹھا تھا کیوں کہ اُس نے اُس کے شانوں سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا تھا ''آئندہ تمہیں کبھی بھی میرے سامنے یوں جھکنا نہیں پڑے گا۔'' اور پھر دن میں کئی کئی بار اُس کی نگاہیں احساسِ تشکر کے طور پر تو جھکتی رہیں لیکن اس کا سر ہمیشہ بلند رہا۔ آج وہ پگلی سمجھ رہی تھی شاید وہی طریقہ اپنا کر اُسے منا لے گی اور وہ آنکھیں کھول کر شانے سے پکڑ کر اُسے کہے گا اب تمہیں کبھی یوں جھکنا نہیں پڑے گا۔ جب کوئی بھی جنبش نہ ہوئی اور کوئی بھی آواز نہ آئی تو اُس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کے سامنے کچھ تصویریں گھومنے لگیں۔ زندگی کے کسی الجھے اور ٹیڑھے میڑھے راستے پر وہ دونوں ملے تھے اور پھر پتہ نہیں کیسے چند ہی روز میں ایک ہو گئے تھے۔ اُسے پروفیسر کے متعلق صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ سندھ کے ایک چھوٹے سے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ باپ اور بھائی خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں، ماں کی صورت اُسے یاد نہیں۔ زندگی کے حوادث کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم کو جاری رکھے رہا۔ یہاں تک کہ کراچی آ کر اپنی تعلیم مکمل کی اور بالآخر اُسے ایک کالج میں ملازمت مل گئی۔ وہ تدریس سے وابستہ ہو گیا۔ اب اُس کی کل کائنات شاگرد تھے یا پھر اُس کی کتابیں۔ وہ نہیں جانتا تھا گھر کیا ہوتا ہے؟ گھر کا آرام اور سکون کیا ہوتا ہے؟ اس کے اندر کا اکیلا پن اُسے لوگوں میں

گھلنے ملنے نہیں دیتا تھا اور خصوصاً جب لوگ ملتے ہوئے پہلا سوال ہی یہ کریں آپ کہاں سے Belong کرتے ہیں؟ گھر کہاں ہے؟ والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ ان سوالوں سے تو وہ خود نا آشنا تھا، جواب کہاں سے لاتا۔ اسی لیے وہ اپنے شاگردوں میں مگن رہتا جو اُس کی بات سنتے، سمجھتے اور اس کی عزت کرتے۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ اُسے ایک گھر نصیب ہوا۔ کرایہ کا چھوٹا سا مکان جسے دونوں میاں بیوی نے گھر بنایا، بیوی کی صورت میں اُسے غم گسار دوست اور ساتھی ملا، جسے اُس نے خدا کا انعام سمجھ کر قبول کیا۔ اب وہ لوگوں سے کتراتا نہیں تھا اُس کے شاگرد اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے جن کا ذکر وہ فخر سے کرتا تھا۔ شادی کے کئی سال ہونے کے باوجود وہ اولاد کی دولت سے محروم رہا۔ جب لوگوں نے اسے اس کا احساس دلانا شروع کیا تو وہ ایک مرتبہ پھر اپنے خول میں بند ہو گیا۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے میاں بیوی میں فاصلہ بڑھنے کی بجائے مزید قربت پیدا ہوئی۔ اولاد کی دولت تو نہ تھی لیکن وہ ایک دوسرے کے لیے کسی دولت سے کم نہ تھے۔ یہ احساس یہاں تک بڑھا کہ جب پروفیسر گھر سے باہر جاتا تو باہر سے تالا لگا جاتا کیوں کہ بیوی کے روپ میں اس کا قیمتی اثاثہ اس کے گھر میں تھا اور جب پروفیسر گھر آجاتا تو بیوی دروازے کو اندر سے تالا لگا دیتی کیوں کہ اب اُسے شوہر کی قربت کی دولت میسر تھی جس کی حفاظت ضروری تھی۔ دن یونہی گزرتے گئے اور شاید یونہی گزر جاتے، اچانک پروفیسر ناک کے کینسر میں مبتلا ہو گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اُس کی تکلیف بڑھتی گئی اور گھر کا اثاثہ ختم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ریٹائرمنٹ ہو گئی لیکن مالی طور پر وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ کرایہ کے گھر سے نکلنا پڑا۔ تھوڑی بہت جو جمع شدہ پونجی تھی اس سے ایک مدرسے کے ساتھ ایک مرلہ کی جگہ لے کر ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کروا کے مکین ہو گیا۔ میاں بیوی کو ایک آسرا تھا کہ پنشن کے ذریعے دونوں دونہیں تو ایک وقت روٹی کھا کر بیماری کا علاج جاری رکھ سکیں گے لیکن پنشن کا اجرا پروفیسر کے لیے غالب کی پنشن کا معاملہ ہو کر رہ گیا۔ وہ ناک پر پٹی باندھ کر کالج کے لمبے لمبے برآمدے ماپتا۔ بولنے میں اُسے دشواری پیش آتی۔ لوگوں کو دیکھتا زیادہ اور بولتا کم تھا لیکن یہاں کسی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس کی نگاہوں کی زبان سمجھی جاتی۔ اس کے وہ شاگرد جو اعلیٰ عہدوں پر تھے کہیں ملتے تو پروفیسر سہارے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا اور وہ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کر کے رخصت ہوتے اور دل میں سوچتے اتنے بڑے آدمی ہو کر آج بھی ہم اپنے استاد سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ آج کے شاگرد میں یہ بات کہاں۔

پروفیسر جب ناکام گھر لوٹتا تو راستے میں لوگوں سے ہاتھ ملاتا لیکن زیادہ دیر کھڑا نہ ہوتا کیوں کہ اب ناک سے ہر وقت مواد بہتا رہتا اور اس کی سانسیں بھی متعفن ہو چکی تھیں اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اُس کے حالات سے آگاہ ہوں۔ جب اُس نے اپنی خوشیوں میں انہیں شریک نہیں کیا تو آج اپنا دُکھ انہیں کیسے سناتا۔ پچھلے ہفتے سے ان کے گھر ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ اس کی بیوی نے اپنے کانوں کی بالیں اُتار کر پروفیسر کے حوالے کرنا چاہیں جو اس نے شادی کے موقع پر بہت ارمان سے اس کے

کانوں میں پہنائی تھیں لیکن اُس نے کہا ''میری زندگی میں یہ تمہارے کانوں سے نہیں اُتر سکتیں'' اور اُس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ پروفیسر اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے چارپائی پر اُسی طرح آ کر لیٹ گیا جیسے کئی سال پہلے وہ پہلی مرتبہ اسے دلہن بنا کر ہاتھ پکڑ کر آیا تھا۔ فرق تھا تو یہ کہ اُس وقت اُس کی بیوی کا سر اُس کی گود میں تھا اور آج اُس کا سر بیوی کی گود میں تھا۔ اُس رات بیوی نے آنکھیں موندی تھیں اور آج پروفیسر نے۔ جب حالت ایسی ہو تو بیوی کا تو کلیجا پھٹنا ہی تھا۔

کئی روز بعد جب تعفن پھیلا تو لوگ متوجہ ہوئے۔ ہمارے ہاں زندہ لاشوں سے لوگ واقف نہیں ہوتے لیکن مردوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ دروازہ توڑا گیا تو لوگوں نے دیکھا ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ ٹوٹی ہوئی بان کی چارپائی پر پڑا ہے جس کے سر میں کیڑے رینگ رہے ہیں۔ ایک ڈھانچہ زمین پر پڑا ہے لیکن اس کا سر دوسرے ڈھانچے کے قدموں میں ہے لیکن کانوں میں بالیاں اور پاؤں میں چاندی کا کڑا ہے۔ گھر میں باورچی خانہ اور غسل خانہ نام کی کوئی چیز نہیں۔ چند پانی کی بوتلیں ہیں اور وہ بھی خالی۔

ایسی خبر کسی بھی اخباری نمائندے کے لیے بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ اُس نے آس پاس رہنے والے کچھ لوگوں کے تاثرات بیان کیے ہیں جو یہ ہیں:

ہمسائے حبیب علی کا بیان تھا ''کبھی کبھی مرحوم راستے میں مل جاتے تھے تو ہاتھ ملا لیتے تھے۔''

دوسرے ہمسائے برکت احمد کا کہنا تھا ''مرحوم بہت شکی تھے گھر سے جاتے وقت باہر سے تالا لگا جاتے تھے۔'' نکڑ والے گھر کے صاحب کا بیان تھا ''میاں ہم کیا جانیں ہم نے تو انہیں کبھی نماز پڑھتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔'' گلی کی مسجد کے خطیب کا بیان تھا ''مرحوم جمعہ بھی پڑھنے نہ آتے تھے۔'' مدرسے کے استاد کا بیان تھا ''انہوں نے کبھی اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی۔'' اگلے روز مرحوم کے وہ شاگرد جو اعلیٰ عہدے پر فائز تھے انہوں نے اخباری بیان جاری کیا کہ ''وہ بہت اچھے استاد تھے ان کی تجہیز و تکفین کا بوجھ وہ خود برداشت کریں گے۔''

لیکن ایک بات جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ کہ جب دروازہ توڑا گیا تو اندر سے تالا کیوں لگا ہوا تھا؟

☆☆☆

اوریانہ فلاشی/خالد سعید

قسط ۹

ایک مرد

اس بے حد دل دہلا دینے والے انکشاف کے بعد تم نے بغاوت کر دی۔ نہیں، ہرگز نہیں، یہ سب کچھ یوں نہیں چلنے دینا چاہیے۔ ایک انسان وقت کے بارے میں جانے بغیر نہیں جی سکتا اور اگر یہ زندگی ہے تو اس سے موت ہی بھلی۔ کاکروچوں اور مکڑیوں کی مینگنیوں سے اندازہ لگانا تو اِس مسئلہ کا کوئی صائب حل نہیں۔ تمہیں اس جہنم سے نکل بھاگنے کا جتن کرنا ہوگا۔ لیکن دریں اثنا تمہارے ساتھ ایک انسانی سلوک تو ہونا چاہیے۔ اویسوع۔۔۔ تمہیں اس سیل کے اندر ایک چارپائی، ایک گھڑی، مناسب واش روم اور روزانہ اخبارات تو ملنا چاہئیں اور تمہاری یہ بھی خواہش تھی کہ تمہارے صیاد تم سے کوئی بات تو کریں۔ بھلے بول نہیں تو دشنام ہی سہی۔ دنیا میں ایسا کون سا آئین ہے کون سا ایسا ضابطہ ہے، جس میں یہ شق بھی شامل ہو کہ مجرم کو وقت کا تعین کرنے کے لیے گھڑی، دن اور تاریخ معلوم کرنے کے لیے کیلنڈر کی سہولت موجود نہ ہوگی۔ اور تمہیں ہمیشہ تنہا رہنا پڑے۔ کوئی تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا روادار نہ ہو ہر طرف خاموشی، قبرستان کا سکوت اور وہ تم سے بھلا تو کیا مندا بولنے کے لیے بھی تیار نہ ہوں۔ جرنل آرنیڈز کو اس بات کا حق کس نے دیا تھا کہ وہ تم سے اس بات کا انتقام لے کہ تمہیں اب تک ہلاک کر کے قبر میں نہ اُتارا گیا تھا؟ تم بھوک ہڑتال کرو گے، اور تم یہ بھوک ہڑتال اس وقت تک جاری رکھو گے جب تک کہ تم ایک گہری بے ہوشی میں نہیں چلے جاتے، اور اگر کمانڈنٹ پیٹسورا کوس نے تمہارے مطالبات پر کان نہ دھرا تو لامحالہ یہ قضیہ پاپا ڈوپاولس کے سر آن پڑے گا، اور اتنی عقل اس میں ضرور موجود ہوگی کہ رائے عامہ کو مشتعل کرنے کی بجائے وہ تمہیں مطلوبہ سہولیات مہیا کر دے گا۔ یہ امر واقعہ تو کسی بھی شک وشبہ سے بالا تھا کہ اتنی عمدہ اور اشتہا انگیز خوراک کے باوجود یہ بھوک ہڑتال قریب قریب پاگل پنا ہی تھی۔ تم اس بات پر ایک خوشگوار انداز میں حیران تھے کہ تمہاری ماں یہاں تمہارے لیے کیا کیا پکوان لے کر آئی تھیں بلاشبہ، یہ بھُنا خرگوش تو بے حد لذیذ ہوگا۔ کیا تمہارے لیے اس دنیا میں اس سے زیادہ پسندیدہ پکوان ہو سکتا تھا؟ شاید سور کی کلیجی۔ اویسوع، اور اماں اور کیا لائی تھیں؟ سٹیو۔ اگر تمہیں بھُنے خرگوش، ساگ میں پکی کلیجی اور سٹیو میں سے ایک کھانے کا انتخاب کرنا پڑتا تو تم پرپیرس سے بھی زیادہ کڑا وقت پڑتا، جسے سب سے حسین دیوی کی خدمت میں ایک سیب پیش کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ دیویاں تو سبھی حسین ہوتی ہیں،'' اور کسے یاد رکھوں کسے بھول جاؤں'' اس بات کو کتنے یگ بیت چکے تھے کہ تمہیں اتنا اچھا اور لذیذ کھانا نصیب ہوا تھا؟ اور اتنا وافر کہ یہ کئی دن تک چل سکتا تھا۔ تم تو تین دنوں میں بمشکل اس کے ایک حصہ سے ہی انصاف کر سکتے تھے۔ چلو آج کے دن تو کلیجی کے مزے ہی لیتے ہیں کیونکہ اس میں بہت جلد بساند پڑ جاتی ہے۔

کل سٹیو کے ساتھ کچھ کرتے ہیں وگرنہ اس کے کھٹا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور کرسمس کے دن کے لیے بھُنا خرگوش۔ بالکل، واہ پیرس کا سبب خرگوش کے حصہ میں آیا۔ وہ بالکل صحیح پکا ہوا تھا اور خوشبودار مصالحوں سے بھرا اور اُس کے بعد پھر بھوک ہڑتال۔ دو دن تک تم اپنے معدہ کو اتنا زیادہ بھر لو گے کہ کرسمس کے دن تمہارے لیے اپنے اندر کافی انڈیلنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ یہ کتنا مشکل امر ہوگا کہ تم کرسمس کے دن بھُنے خرگوش کے ذائقے سے لطف اندوز نہ ہو، لیکن اُس سے اگلا دن تمہارا ہوگا، اور تم نے خرگوش سے مخاطب ہو کر کہا'' اے حسیں اے حسیں، تھوڑا انتظار اور، ذرا سا صبر اور جان! تو ہم چوبیس گھنٹے کے لیے بھوک ہڑتال کو ملتوی کیے دیتے ہیں۔ آج تو میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ میری جان مجھے اس گستاخی کے لیے معاف کر دینا۔'' پھر تم نے پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ سیل کے اندر دروازے اور اس کے مخالف دیوار کے درمیان آگے پیچھے جا کر رقص کیا، ناچ کے چوتھے موڑ پر بہر حال تم غصے سے لال بھبھوکا رُک گئے۔ ایک طیش مند حیرت، دروازے کے بارے میں کوئی بات صریحاً خلاف معمول تھی۔ عموماً دروازے میں موجود ایک سوراخ سے جو روشنی اندر آتی تھی، آج معدوم تھی۔ لیکن ایسا کیوں؟ تم دروازے کی جانب بڑھے اور اُس کے ایک پٹ پر اپنا ماتھا ٹیک دیا، اور فوراً ہی تم پیچھے کی جانب اُچھلے جیسے تمہیں کسی زہریلی شے نے ڈنک مار دیا ہو۔ سوراخ کی دوسری جانب ایک آنکھ تمہیں جھانک رہی تھی۔ لعنت ہو اِن خنزیروں پر! انہوں نے تمہیں بھُنے خرگوش سے مکالمہ کرتے، رقص کرتے اور ایک احمق کی مانند حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ایک شرم ناک الجھاوے میں تم سرخ پڑ گئے۔ وہ کون تھا؟ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ کون تھا، لیکن وہ جو کوئی بھی تھا، اُسے اس حرکت کی کڑی سزا ملنی چاہیے۔ تم نے ہتھکڑی سمیت اپنے بازو اُٹھائے اور اپنی دائیں انگشت شہادت کو پوری قوت سے اُس سوراخ میں گھُسا دیا۔ اس حرکت کا ردِعمل ایک تکلیف دہ چیخ کی صورت میں آیا۔ پھر ایک کورس میں مشتعل آوازیں:'' جلدی کرو جلدی، اُس پاگل کو پکڑو! اُس نے اُسے گھائل کر دیا ہے۔ نہیں اُس نے اُسے تقریباً اندھا کر دیا ہے۔ تقریباً سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اُس نے تو اُس کی آنکھ ہی پھوڑ دی ہے۔ یہ جانور، وحشی، خبیث!'' ''جلدی کرو آؤ اِس جانور کو سبق سکھائیں'' ایک اور بالکل مختلف آواز'' نہیں، نہیں ایسا مت کرنا، مجھے بالکل صحیح دکھائی دے رہا ہے۔ اُس نے میری آنکھ نہیں پھوڑی۔ میں دیکھ سکتا ہوں، میں قسم اُٹھاتا ہوں، مجھے نظر آ رہا ہے، یہ محض ایک اتفاق ہے۔ ایک حادثہ! اُس نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا میں تم سب سے درخواست کرتا ہوں، خدارا، یسوع کے نام پر اُسے اکیلا چھوڑ دو۔ یہ کرسمس کے دن ہیں!'' لیکن اُس کی اِس بنتی نے اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔ ایک جھٹکے اور پٹاخ کی آواز کے ساتھ سیل کا دروازہ کھلا اور اُن میں سے سات غیض و غضب کے عالم میں بدلہ لینے کے لیے اندر آن گھسے۔'' جانور، غلیظ جانور، وحشی، تمہیں کرسمس کا تحفہ چاہیے۔ ابھی تمہاری خدمت میں پیش کرتے ہیں۔'' یوں لگ رہا تھا کہ فالج کے ایک طویل وقفے کے بعد اچانک اُن کے گلے کے پٹھے بحال ہو گئے ہوں وہ تمہیں شکست فاش دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ پورے

ایک ماہ کے وقفے کے بعد اُن کی خاموشی کا بند اچانک ٹوٹ گیا۔ وہ بآواز بلند چیخ و چنگھاڑ رہے تھے اور ساتھ ہی تمہیں پوری قوت کے ساتھ ضربیں لگا رہے تھے۔ وہ ساتوں کے سات مل کر تمہاری دھنائی کر رہے تھے۔ ہتھکڑیوں کی وجہ سے تمہاری حرکات بے ترتیب تھیں اور تم اپنے دفاع کے لیے کوئی کوشش بھی نہ کر سکے اور جلد ہی تمہاری جگہ فرش پر کچلے ہوئے بھُنے خرگوش اور الٹی ہوئی گندی بالٹی کی غلاظت کے درمیاں زخموں اور خراشوں سے بنی ایک سرخ لوتھ پڑی تھی کرسمس مبارک، کرسمس مبارک۔

اور اس سب کے باوجود اِس کرسمس دھنائی نے تمہارے لیے کئی آسانیاں پیدا کیں۔ مثلاً اس چھترول کے نتیجے میں بوئیاٹی (Boiati) میں تمہاری پہلی بھوک ہڑتال نسبتاً قابل برداشت ہوگئی۔ بھوک ہڑتال میں دراصل ابتدائی مرحلہ ہی دشوار ہوتا ہے۔ یعنی صرف پہلے تین دن۔ جب یہ عرصہ گزر جائے تو تمہیں بے پناہ کمزوری تو ضرور محسوس ہوتی ہے لیکن غذا کے لیے کوئی طلب یا خواہش باقی نہیں رہتی اور اگر تم اپنی بھوک ہڑتال اُس مار پیٹ کے بعد شروع کرو کہ جس نے تمہیں یوں بے سُدھ کر دیا تھا تو تمہیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ تمہارا معدہ خالی ہے یا بھرا ہوا ہے اور خوراک وہ آخری شے ہے کہ جس کے بارے میں تم کچھ سوچتے ہو۔ اور جیسے ہی وہ ساتوں تمہیں سیل میں چھوڑ کر گئے تم نے اپنی سوچی سمجھی بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ہڑتال کے پہلے بہتر (۷۲) گھنٹوں میں تم نے پانی لینے سے بھی مطلقاً انکار کر دیا۔ اُس کے بعد تم نے تھوڑی سی کافی پی۔ اُس کے بعد پھر تم نے کسی طرح کی خوراک لینے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ تم ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے۔ تمہیں اس حالت زار میں ای ایس اے کے اُسی ڈاکٹر نے دیکھا جس نے تمہاری گرفتاری کے پہلے تمہیں مدد دینے کی کوشش کی تھی۔ تم اُس دِن قریب قریب مردہ حالت میں تھے۔ کیونکہ گزشتہ دو ہفتوں سے غذا کا ایک تنکا بھی تمہارے منہ تک نہ گیا تھا۔ یکا یک تمہیں اپنے ایک بازو میں سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ ایک حرکت کے احساس نے تمہارے لہو کو گرما دیا۔ یکا یک تم نے خود کو بھلا چنگا محسوس کیا۔ تم نے اپنی پلکیں اُٹھائیں۔ وہ تمہارے اوپر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کے شاطر چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ستم ظریفی اور سازباز چھلکتی تھی۔ ''ہیلو آلیکاس'' ''تم کون ہو؟'' ''تم مجھے جانتے ہو، ایک ڈاکٹر، ویسے اگر تم میرا نام جاننا چاہتے ہو تو میرا نام ڈانا روکاس (Danarokas) ہے'' ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' ''میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں'' ''اُس سرکاری ڈاکٹر کی مانند میری مدد کرنا چاہتے ہو جو مجھ پر ہونے والے تشدد کی نگرانی کرتا رہا'' ''میں کسی پر ہونے والے ظلم و تشدد کا تماشہ نہیں دیکھتا'' ''جھوٹے، کذاب'' اُس نے تمہاری بات کا جواب تمہارے منہ میں پنی سمیت ایک چاکلیٹ کو ٹھونسنے سے دیا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ بھوک ہڑتال کیوں کی ہے'' ''کیونکہ مجھے ایک کیلنڈر چاہیے ایک گھڑی اور کیلنڈر، اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ کم سے کم مجھ سے کوئی بات چیت تو کریں۔'' ''یہ تو کوئی زیادہ مطالبات نہیں، بتاؤ اور کیا چاہیے؟'' ''میری ہتھکڑی اُتار دی جائے۔'' ''یہ بھی کوئی ایسا بڑا مطالبہ نہیں، بتاؤ اور کیا چاہیے؟'' ''میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک چارپائی مہیا کی جائے'' ''یہ تو بہت معمولی مطالبہ ہے''

''ایک فلش ٹائلٹ'' ''اور پھر'' ''اخبارات، کتابیں، قلم اور کاغذ'' ''ہاں اب یہ کچھ ٹھیک ہے۔ اگر تم اُن سے صرف ایک مطالبہ کرو گے تو وہ اسے کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن اگر تم بہت سی سہولتوں کا مطالبہ کرو گے تو بادل نخواستہ ہی سہی مگر ایک دو سہولتیں مہیا کر دیں گے۔ میں حکام بالا تک تمہارے یہ مطالبات پہنچا دوں گا، خیر اتنی دیر یہ چاکلیٹ کہیں چھپا دو۔ اگلی بار میں کچھ اور چیزیں چھپا کر لے آؤں گا۔'' وہ مطالبات کی فہرست لے کر روانہ ہو گیا۔ اگلے دن وہاں چارپائی مہیا کر دی گئی۔ دو دن بعد ایک خوش شکل اور متحمل مزاج فوجی ظاہر ہوا۔ ''صبح بخیر، آلیکاس''

کرسمس کے دن انہوں نے اُسے تمہاری شناخت بتائے بغیر تمہارے سیل کی حفاظت پر معمور کیا۔ انہوں نے تمہارے بارے میں صرف یہ آگاہ کیا تھا کہ تم ایک حد درجہ خطرناک اور عادی مجرم ہو۔ لہٰذا وہ تم سے کسی بھی طرح کی گفتگو سے مکمل اجتناب کرے۔ لیکن اس عجیب حکم سے اُس کے دل میں ایک گہرا تجسّس پیدا ہوا۔ اور اُس نے دروازے کے سوراخ میں سے تمہارا مشاہدہ کرنا شروع کر دیا۔ دراصل وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایک خطرناک اور عادی مجرم کیسا دکھائی پڑتا ہے اور تمہیں اپنی جانب دیکھتے ہی اُس نے اپنی ایک آنکھ کو اپنی ایک انگلی سے ڈھانپ لیا۔ تم نے ایک عالم طیش میں اُس کا جائزہ لیا ''کون ہو تم؟'' ''میں۔۔۔ میں وہ ہوں جس کی آنکھ میں تم نے اپنی انگلی دے ماری تھی۔'' ''تم میری جاسوسی کر رہے تھے، اس لیے میں تمہیں ایک سبق سکھانا چاہتا تھا'' ''لیکن میں تو کوئی جاسوس نہیں ہوں اور نہ ہی سرکاری ایجنٹ'' ''سارے جاسوس یہی کہتے ہیں میں تو کوئی جاسوس نہیں ہوں۔'' مختصر الجثہ نوجوان فوجی مسکرایا اور تمہاری بات کا جواب دیئے بغیر خاموشی سے غلیظ بالٹی کو صاف کرنے کے لیے اُٹھایا۔ کیا خبر یہی شخص میرے ساتھ مخلص ہو؟ اگر تم اس کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہو تو تمہیں اُسے اشتعال دلانا ہوگا اور تم نے جان بوجھ کر اُسے غصہ دلانا شروع کیا ''او پاپا ڈوپولکی مجھے لگتا ہے کہ تمہیں انسانی فضلہ اُٹھانے میں لطف آتا ہے'' ''بالکل نہیں، لیکن آلیکاس مجھے تم اچھے لگتے ہو، اس لیے تمہارا گند صاف کرنے سے مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے۔'' او میرے خداوندا! یہ تو ایک سچا اور کھرا انسان لگتا ہے۔ تم اُس کا انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ وہ بالٹی کو صاف کر کے لے آیا اور تم نے ایک بار پھر اُس کے ناک میں دم کرنا شروع کر دیا۔ ''او پاپا ڈوپولکی، میری پتلون کھولو، مجھے پیشاب لگا ہے۔'' وہ انتہائی حلیمی سے دوبارہ مسکرایا۔ اُس نے صاف شدہ بالٹی کو زمین پر رکھا اور پھر انتہائی سنجیدگی اور گھمبیرتا سے تمہاری بیلٹ ڈھیلی کر کے پتلون کھول دی۔ ''اب مجھے پیشاب کراؤ'' ''نہیں آلیکاس، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ ویسے بھی یہ ایک معیوب بات ہے۔ میں تمہاری ہتھکڑیاں کھولے دیتا ہوں اور اس سلسلے میں تم اپنی مدد خود کرو۔'' ''اوہ، میں سمجھا! تو پاپا ڈوپولکی انہوں نے تمہیں میری ہتھکڑیاں کھولنے کی اجازت دے دی ہے؟'' ''نہیں، بالکل نہیں، انہوں نے مجھے ایسی کوئی اجازت نہیں دی، لیکن میں ایک مدت سے ایسا کرنا چاہتا تھا۔'' ''سنو، مجھے تمہاری کسی بات پر کوئی یقین نہیں۔'' ''تمہیں اس بات کا حق ہے کہ تم میری بات پر یقین نہ کرو۔'' تم کچھ نرم پڑ گئے ''تو اس سے پہلے تم نے مجھ

ے کوئی بات کیوں نہیں کی؟'' ''اس لیے کہ میں تمہیں نہیں جانتا تھا۔'' ''یا پھر اس لیے کہ تم میں یہ کچھ کرنے کی جرأت ہی نہ تھی کیونکہ تم تو اُن کے حکم کے بندے تھے؟'' ''ہاں یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ تم سے کسی طرح کی بات چیت سے سختی سے منع کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود، اُن گزشتہ چند دنوں میں جب تم ہذیان کی حالت میں تھے، میں تم سے اکثر بات چیت کرتا رہتا تھا۔ خیر۔۔۔ اِن باتوں کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ میں اب تمہاری ہتھکڑیاں کھول دوں؟'' ''اگر تم میری ہتھکڑیاں کھول دے گے، تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔'' ''اگر تم یہاں سے بھاگ لوگے، تو وہ تمہیں لازماً پکڑ لیں گے اور پھر میری بجائے کسی ایسے فوجی کی ڈیوٹی لگائیں گے جو بہرحال تمہارا دوست نہ ہوگا۔'' تم نے اُس کے سامنے اپنی کلائیاں بڑھا دیں۔ اُس نے ہتھکڑیاں کھول دیں۔ ''اگر اب میں تمہاری کنجیاں اور پستول چرا لوں یا چھین لوں؟'' ''نہیں، تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔'' ''مگر کیوں نہیں؟'' ''کیونکہ ایسا کرنا صریحاً حماقت ہوگی، اچھا خیر اس بات کو چھوڑو، تم نے پیشاب کرنا ہے یا نہیں؟'' بے یقینی حالت میں تم پیشاب کرتے ہوئے چور آنکھوں سے اُس کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ نہیں، وہ قطعاً جھوٹا نہ تھا۔ تمہاری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ کسی طرح کی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد تم نے دوبارہ اپنی کلائیاں اُس کے آگے بڑھا دیں تاکہ وہ ایک بار پھر تمہیں ہتھکڑیاں ڈال سکے۔ تمہاری دائیں کلائی پیپ سے بھری پڑی تھی اور زخم اتنا گہرا تھا کہ ماس کی بجائے ہڈی نظر آ رہی تھی۔ ''آلیکاس، یہ تمہیں کیا ہوا ہے۔ تمہارا علاج ہونا چاہیے۔ زخم کے لیے مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔'' ''او پاپاڈوپولکی، اپنا کام کرو، مجھے ہتھکڑیاں ڈالو اور یہ ناٹک بند کرو۔'' ''آلیکاس تم انصاف سے کام نہیں لے رہے۔ میں اتنے گہرے گھاؤ پر ہتھکڑی نہ ڈالوں گا۔ میں ابھی جا کر تمہارے لیے دوا لے کر آتا ہوں اور اس کلائی کی مرہم پٹی کر دوں گا۔'' ''نہیں، کوئی ضرورت نہیں'' ''خیر میں تو جا ہی رہا ہوں۔'' وہ چلا گیا اور پھر پورے ایک گھنٹہ کے بعد مرہم اور پٹی لیے لوٹا ''او پاپاڈوپولکی، تم نے بہت دیر لگا دی، کیا اپنی کارگزاری کی رپورٹ کرنے گئے تھے؟'' ''نہیں بالکل نہیں، میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی تمہارے ہاتھوں کو آزاد رہنے دوں اور اسی لیے ادھر اُدھر مٹرگشت کرتا رہا۔'' پھر اُس نے تمہارے زخم کی مرہم پٹی کی اور پھر کوئی لفظ ادا کیے بغیر تمہاری کلائیوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ اُس کے چہرے کے تاثرات نے تمہیں اُس کے خلوص کا قائل کر دیا۔ ''شکریہ، اے پاپاڈوپولکی'' ''میں پاپاڈوپولکی نہیں ہوں، میرا نام موراکس (Morakis) ہے۔ کارپورل موراکس۔''

تمہیں اس امر کا قائل ہونے میں قریب قریب ایک مہینہ لگا کہ وہ تم سے کوئی جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور اس عرصہ میں اُس کے ساتھ تمہارا سلوک بے حد سنگدلانہ اور سفاکانہ تھا۔ تم اس تکنیک کو ضرورت پڑنے پر انتہائی موثر انداز میں برتنا جانتے تھے۔ بالخصوص جب تمہیں کسی کی سچائی کو جاننا مقصود ہوتا تم جس کسی کو جتنا زیادہ پسند کرتے، تمہیں اُس سے اتنا ہی زیادہ بے وفائی اور دھوکہ دہی کا خدشہ ہوتا۔ اور یہ کہ

کہیں تم اُس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آ جاؤ لہٰذا تم ہر قریبی فرد کو تکلیف و ایذا سہنے پر مجبور کر دیتے۔ بہرحال آخر کار تم اُس کی نیک دلی اور خلوص کے قائل ہو گئے۔ وہ تم سے بہت پیار کرتا تھا اور بعض اوقات تم خود سے یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہو جاتے کہ اُس کے بغیر تم کسی طور جی نہ سکتے تھے۔ یہ وہ ہی تھا، جو دِن میں تین بار بالٹی سے غلاظت صاف کرتا تھا، علاوہ ازیں تمہیں اخبارات، کاغذ اور پنسلیں مہیا کرتا تھا۔ پیٹسورا کوس (Patsourakos) تمہیں یہ سہولتیں دینے سے ہچکچاتا تھا۔ ویسے وہ کوئی جابر یا سفاک شخص نہیں تھا۔ اُس نے تو کچھ دیر کے لیے تمہیں اپنی ماں سے جنگلے والے وزیٹرز روم کی بجائے چیپل میں ملاقات کی اجازت دی تھی لیکن ہوا یہ کہ ایک دن محافظ نے تمہیں اپنی ماں کو ایک رقعہ پکڑاتے ہوئے دیکھ لیا اور آئیونیڈیز (Ioannidis) کے عتاب سے بچنے کے لیے موراکس نے تم سے یہ سہولیات واپس لے لیں۔ بھوک ہڑتال کے ذریعے حاصل کی جانے والی سہولتیں جو دانا روکاس (Danaroukas) کی مداخلت سے ملی تھیں ختم ہو گئیں۔ اب تمہارے پاس محض ایک چارپائی رہ گئی تھی اور موراکس، ہر بار پکڑے جانے کے حقیقی خطرے کے باوجود تمہاری ہتھکڑیاں کھول دیتا تھا اور اس امر واقعہ نے تمہیں دل سے قائل کر دیا کہ تم اُس پر مکمل بھروسہ کر سکتے تھے اور تم نے اُس کے سامنے اعتراف کیا کہ تم جیل سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ وہ تمہارے اس اعتراف سے قطعاً حیرت زدہ نہ ہوا۔ ''مجھے معلوم ہے مگر یہ ایک مشکل کام ہے۔'' ''نہیں، مجھے صرف ایک یونیفارم کی ضرورت ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی زائد یونیفارم ہے؟'' ''میرے پاس ایک زائد یونیفارم ہے۔'' تم نے اپنی اور اُس کی پیمائشوں کا موازنہ کیا۔ بلاشبہ وہ قد میں تم سے چھوٹا تھا اور اُس کے شانے بھی کم چوڑے تھے، لیکن مجموعی طور پر تمہارے اور اُس کے جسم میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ ''ٹھیک ہے تم مجھے اپنی زائد یونیفارم دو گے اور خود تم یہی یونیفارم پہنے رہو گے۔'' ''میں؟'' ''بالکل فطری بات، تم نے میرے ہم رکاب ہی ہونا ہے۔'' ''لیکن میں'' ''یوں اپنی شکل نہ بگاڑو، تمہارے پاس اس خیال کا عادی ہونے کے لیے بڑا وقت پڑا ہے۔ ابھی تو مجھے اپنی توانائی بحال کرنی ہے اور میری ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ دروازے تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول جاتا ہے۔'' ''اور جب تم اس کے بارے میں سوچتے رہو___'' ''میں نہیں جانتا، ہمیں کوئی ایسی جلدی بھی نہیں، اب میرے لیے شام کا شکتیوں بھرا کھانا لاؤ۔'' وہ تمہارے لیے کھانا لایا اور تم نے پورے ذوق و شوق سے پیٹ بھر کر کھایا۔ تم ہر روز اسی طرح پوری اشتہا کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ تم اس قدر تابع فرمان اور اطاعت شعار ہو چکے تھے کہ تم سے خوش ہو کر پیٹسورا کوس (Patsourakos) نے تمہیں کرسی اور میز رکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر صحن میں چہل قدمی کی بھی اجازت دے دی لیکن تمہیں ہتھکڑیوں سے رہائی کبھی نہ ملی کہ ای ایس اے والے تمہیں یہ رعایت کسی صورت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ ''کیا ہمارا ناٹک ٹھیک جا رہا ہے کمانڈنٹ؟'' ہتھکڑیوں یا اُن کے بغیر بتدریج تمہاری صحت بحال ہوتی گئی۔ موسم گل کے آتے آتے تمہاری کلائیوں کے زخم تقریباً بھر چلے تھے۔ تمہارا وزن بھی پہلے سے بہتر ہو گیا تھا اور تمہیں انتہائی خوش آواز میں اپنی اُس اُداس نظم کو

گاتے ہوئے بھی سنا جا سکتا تھا جو تم نے مقدمہ کے التوا کے ہفتہ میں لکھی تھی:

''سفید فاختائیں جا چکیں!
آسمان، کووں سے بھرا پڑا
یہ سیاہ نحس پرند!''

تمہیں یہ گیت اس لیے بھی پسند تھا کہ خواہ تم اسے کسی بھی دھن میں گاتے، فوجی محافظ اس سے چڑ جاتے۔۔۔''''آلیکاس، مردود، اپنی بکواس بند کرو!'' پھر مئی کا مہینہ اپنی پوری حدتوں کی ہم رکابی میں آیا اور ایک خوف ناک واقعہ ہوا۔

ایک صبح انہوں نے تمہاری ہتھکڑیاں کھول دیں۔ تمہیں گرم پانی کی بالٹی دی تا کہ تم غسل کر سکو۔ حجام نے تمہاری مناسب حجامت اور شیو کی۔ پھر اُنہوں نے تمہیں ایک صاف قمیض اور پتلون مہیا کی اور تمہیں صحن میں چہل قدمی کرنے کی کھلی اجازت دے دی۔ تم اُن کی اس پیشکش سے متحیر تو ضرور ہوئے مگر تمہارے اندر کسی طرح کے شبہات پیدا نہ ہوئے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ انہوں نے تمہارے مطالبات کو تسلیم کر لیا تھا اور تمہارے لیے اس معمولی سہولت کو مسترد کرنے کا کوئی جواز موجود نہ تھا۔ تم سیل سے باہر نکل آئے۔ صحن میں کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ تم نے دیوار کے ساتھ اپنی کمر لگائی اور اپنا چہرہ سورج کی جانب کیا۔ یکا یک ایک فٹ بال تمہارے پاؤں سے ٹکرایا۔ تم نے نیم بند آنکھوں سے یہ دیکھنے کی سعی کی کہ یہ فٹ بال تمہاری جانب کس نے پھینکا تھا لیکن تیز چمکتے سورج میں تم اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے کسی کو نہ دیکھ سکے۔ یہ موراکس (Morakis) تو نہیں تھا؟ تم نے آہستگی سے فٹ بال کو ٹھوکر لگائی۔ فٹ بال پھر تمہاری جانب واپس آئی۔ بس یہیں کہیں چھپا ہوا یہ موراکس ہی ہوگا اور تم سے مسخریاں کر رہا ہے۔ اب تم نے ذرا پُر جوش ہو کر فٹ بال کو ایک اور ٹھوکر لگائی۔ فٹ بال مقابل کی دیوار سے ٹکرائی اور پھر پلٹ کر تمہارے قدموں کے جانب آئی۔ اچھا، موراکس! تو وہ تمہیں مقابلہ پر اُکسا رہا ہے۔ میں اُس کا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ گو تمہیں فٹ بال کھیلے ہوئے، لگتا تھا کہ صدیاں ہی بیت گئی ہیں اور سانس پھولنے کے باوجود تم اس پر ثابت کر دو گے کہ اب بھی تم اُسے اس کھیل کے دو یا تین اہم گُر اور داؤ پیچ سکھا سکتے ہو۔ ''یہاں، ادھر، یہ!'' فٹ بال کو ٹھوکریں لگاتے لگاتے تمہارا سانس بے طرح پھول گیا اور تم ہانپتے ہوئے رُک گئے۔ ''موراکس، بس کرو، میں تھک گیا ہوں!'' لیکن کسی نے تمہاری بات کا جواب نہ دیا۔ تو کیا یہ بندہ موراکس کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟ اور جیسے ہی تم نے خود سے یہ سوال کیا۔ تم پر انتہائی ناخوشگوار احساسات طاری ہوئے، جیسے کوئی چھپ چھپ کر تمہیں دیکھ رہا ہے۔ تم نے دیکھنے کی کوشش کی، مگر دُور دُور تک تمہیں صحن میں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ کوئی بھی تو نہ تھا۔ اب جب کہ تمہاری آنکھیں روشنی کی عادی ہو رہی تھیں، تمہیں صحن کے اختتام پر ایک سرجنٹ دکھائی دیا۔ وہ تمہیں ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا ''آلیکاس بہت اچھے، کھیلتے رہو، شاباش، کھیل جاری رکھو۔'' تم اُسے نہیں جانتے تھے۔ وہ کون تھا؟

''بہت اچھے، آلیکاس، کھل کر کھیلو، ایک اور کِک!'' ایک گہری شرمندگی کے احساس کے ساتھ تم نے اپنا چہرہ دوسری جانب کیا اور واپس اپنے سیل کی جانب روانہ ہوئے۔ سیل میں تم موراکس کی آمد کا انتظار کرتے رہے اور جب وہ اگلے دن لوٹا تو جس انداز میں اُس نے اخبارات تمہارے حوالے کیے، اُس سے پوری کہانی تمہاری سمجھ میں آ گئی۔ جب تم فٹ بال کھیلنے میں مصروف تھے تو وہ تمہاری ہر ہر حرکت کی فلم بنا رہے تھے۔ تمہارے فوٹو گراف کھینچے جا رہے تھے اور وہ بیرونی پریس اور ریڈیو کی مذمت کر رہے تھے جو ''محبِّ وطن'' یونانی فوجی جنتا پر یہ گھناؤنے الزامات دھرتے تھے کہ تمہیں نو ماہ سے زائد عرصہ تک ہتھکڑیوں میں رکھا گیا ہے اور تمہیں ننگے فرش پر کتے کی مانند سونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ کہ اس سارے عرصہ تمہیں سورج کی روشنی سے محروم رکھا گیا۔ جیسے تمہیں زندہ دفن کر دیا گیا ہو۔ یونانی ''محبِّ وطن'' صحافی اور تقریباً ہر ملک کے نمائندہ صحافی اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے کہ یہ سارے الزامات غلط ہیں اور ''محبِّ وطن'' وردی والی سرکار کو خواہ مخواہ بدنام کیا جا رہا ہے۔ تمہیں کوئی ہتھکڑی نہ لگائی گئی تھی تمہاری صحت مثالی تھی۔ تمہیں عمدہ لباس مہیا کیا گیا تھا۔ تمہارے ساتھ اُن کا سلوک انتہائی دوستانہ تھا اور یہ کہ جب تمہارا جی چاہتا تم اپنی مرضی سے سیل سے باہر آ سکتے تھے اور تمہیں سورج کی اس قدر روشنی میسر تھی کہ کسی ہدایت یا حکم نامے کے بغیر تم جب تک تمہارا جی چاہے اس سے لطف اندوز ہو سکتے تھے اور پھر پوری آزادی اور اپنی رضا سے واپس اپنے سیل جا سکتے تھے۔ موراکس شکست مجسم تھا۔ وہ حرماں و یاس کی تمثال بنا تھا۔ ''آج صبح میری چھٹی تھی۔۔۔ اگر میں یہاں ہوتا تو ایسا کچھ نہ ہونے دیتا۔۔۔ میں تمہیں اس کے بارے میں پیشگی اطلاع دے دیتا۔۔۔ لیکن مجھے گزشتہ رات ہی اس شیطانی منصوبہ کے بارے میں علم ہوا تھا۔۔۔ اور میرے بس میں کچھ نہ تھا۔'' ''لیکن آخر وہ اتنے سارے لوگ کس جگہ سے میری حرکات کو دیکھ رہے تھے۔'' ''کمرہ ملاقات میں سے، ای ایس اے والوں نے انہیں وہاں چھپا رکھا تھا اور وہ کھڑکیوں میں سے تمہاری حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔'' ایک سکتہ کے عالم میں تم کچھ لمحوں تک خاموش رہے اور پھر تم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور پھر تم نے موراکس کو بتایا کہ وہ تیار رہے کہ ایک ہفتہ کے اندر تمہیں جیل سے فرار ہونا ہے۔

یہ پانچ جون ۱۹۶۹ء کو جمعہ کی رات اور ساری جیل سو رہی تھی۔ موراکس (Morakis) ایک بیگ لایا، جس میں تمہارے لیے فوجی وردی تھی۔ تم نے فی الفور وہ وردی زیب تن کی۔ پھر تم نے اپنے کپڑے بیگ میں ٹھونس دیئے اور کمبلوں کو چارپائی پر اس طرح بچھایا کہ اگر دروازہ کے سوراخ سے اس کا مشاہدہ کرے تو اُسے یوں لگے کہ جیسے اس میں کوئی بندہ سو رہا ہے۔ تب تم نے موراکس (Morakis) کو حکم دیا ''چلو، اب یہاں سے چلتے ہیں۔'' تمہارا موڈ ایسا تھا جیسے تم پکنک پر جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ تمہارے برعکس موراکس (Morakis) کی حالت بے حد خراب تھی۔ یہ احساس کہ وہ فوجی بھگوڑا ہونے جا رہا ہے اور جیل سے ایسے شخص کے فرار ہونے کا ذمہ دار ہے جس سے فوجی جنتا حد درجہ خوف زدہ ہے، اُسے

مضطرب کیے جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ''آلیکاس سیل کو تالا لگاؤ، مجھ سے یہ نہیں ہوگا'' اُس نے سیل کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے چابیوں کا گچھا تمہیں پکڑا دیا تم نے نپے تلے اور مضبوط ہاتھوں کے ساتھ سیل کے دروازے کو تالا لگایا اور رات کو اتھاہ تاریکی میں چل دیئے۔ ابھی تمہیں اس امر کا قطعاً اندازہ نہ تھا کہ جیل کے مین گیٹ سے باہر نکلنے کا پہلا مرحلہ اور مسئلہ کیونکر طے ہوگا۔ اگر تمہیں پہرے دار نے پہچان لیا تو کیا ہوگا؟ اگر پہرے دار کو تم پر شک ہوا اور اُس نے تم سے شناختی کاغذات طلب کیے تو پھر کیا ہوگا؟ پہرے دار غنودگی کے عالم میں تھا۔ موراکس بے حد گھبرایا ہوا تھا اور اُس نے تم سے کہا ''آلیکاس پہرے دار سے بات تم ہی کرو۔'' تم نے پورے اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھائے ''اوکاہل، ہڈحرام، ست الوجود، آنکھیں کھولو۔'' پھر تم نے کنجیوں کا گچھا اُس کے آگے لہرایا۔ نکمے، کام چور، کاہل، گیٹ کھولو۔'' ''لیکن جناب کارپورل ___'' ''اپنے افسر کے سامنے بولنے سے پہلے اٹنشن ہوتے ہیں پتہ ہے۔'' ''جی جناب کارپورل'' ''تمہاری جیکٹ کے بٹن اس طرح کیوں کھلے ہوئے ہیں؟ تم نے وردی پہننے کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے؟'' ''نہیں سر، جناب کارپورل، خدارا مجھے معاف کر دیجئے۔'' ''مجھے پہلے یہ اطمینان کرنے دو کہ یہاں ہر شے ٹھیک ٹھاک جا رہی ہے۔'' ''جی سر، جی جناب کارپورل، آپ پورا معائنہ کر لیجئے۔'' اور تمہارے پیچھے موراکس (Morakis) نیم غشی کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ ''آلیکاس، اوہ نہیں! اس کی کیا ضرورت ہے! ارے نہیں! مت کرو۔'' لیکن تم نے اُس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور معائنہ کے سوانگ میں پوری ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے اپنا کردار ادا کیا۔ ''ادھر دیکھو! کیا کنجیاں اس طریقے سے رکھتے ہیں! شرم کرو! بے حیا! لعنتی، اس طرح کی لاپرواہی برتنے سے کوئی بھی قیدی جیل سے فرار ہو سکتا ہے۔ خیر اس بار تو میں تمہیں چھوڑے دیتا ہوں لیکن خبردار کل سے میں چاہتا ہوں کہ ہر چیز کے بارے میں تم خود رپورٹ کرو، سمجھے؟'' ''جی جناب کارپورل'' ''گیٹ کھولو'' ''جناب کارپورل، ابھی اسی وقت'' ''بالکل، اور جب ہم واپس آئیں تو چلا چلا کر یہ مت بتانا کہ یہاں سے کون کون آ جا رہا ہے؟ یا اس طرح کی کوئی اور خرافات، میری بات سمجھے ہو؟'' ''جی جناب کارپورل'' اُس نے دروازہ کھول دیا اور اب تم اُس آرمی کیمپ میں تھے جس کا ایک حصہ یہ جیل تھی اور اب تمہیں دوسرا زیادہ کٹھن مرحلہ درپیش تھا کہ اس کیمپ سے باہر کیونکر نکلا جائے؟ پہلے کے سے انداز میں پہرے داروں کے سامنے آنا اور وہی سوانگ رچانا ناممکن العمل تھا، بیرونی دیوار کو پھلانگنے میں حد درجہ خطرات تھے۔ فوجی برجیوں سے سپاٹ لائٹس، ہر پندرہ سیکنڈ کے بعد علاقہ کو روشن کر دیتی تھیں، لیکن اس شدید خطرہ کے باوجود نجات کی کوئی اور راہ موجود نہ تھی۔ تم دُبک کر رینگتے ہوئے اُس مقام تک پہنچے جو فوجی بیرکس سے سب سے زیادہ فاصلے پر واقع تھا، اور وہیں بیٹھ کر مناسب موقع کا انتظار کیا، اور جب یہ موقع آیا ''چل میرے بھائی!'' موراکس (Morakis) انتہائی پھرتی سے تمہارے کاندھوں پر چڑھا اور دیوار کی نُکر کو تھام کر دیوار پر آ گیا۔ پھر اُس نے تمہاری جانب نیچے بازو پھیلائے اور اُس کے سہارے تم بھی دیوار پر چڑھ آئے۔

''خاردار تار بے حد خطرناک ہے۔ دھیان رہے!'' خاردار تار یا پھر فوجی برجیوں سے آنے والی روشنیاں جو تمہاری جانب بڑھ رہی تھیں اور کسی بھی لمحہ میں تم اُن کے زد میں آ سکتے تھے۔ ''چل میرے بھائی۔۔۔ اور چھلانگ'' فضا میں کچھ پھٹنے کی دوہری آوازیں آئیں۔ تم دونوں کی پتلونیں پھٹ چکی تھیں اور تمہاری تو جیکٹ بھی ساتھ ہی اُدھڑ گئی تھی لیکن پھلاندنے میں تم کامیاب ہوئے۔ نہ تو تم دونوں کے ٹخنوں میں کوئی موچ آئی اور نہ ہی کوئی بڑی خراش یا زخم۔ تم بآسانی پہاڑی کی ڈھلان سے سڑک کی جانب دوڑتے چلے گئے۔ وہاں سے ایک گڈریا اور اُس کا ریوڑ گزر رہا تھا اور تمہاری راہ میں واحد رکاوٹ اُس ریوڑ کا کتا تھا۔ کتا تمہاری جانب بڑھ رہا تھا۔ ''کیا یہ کتا ہمیں دیکھ لے گا؟'' ''اُمید کرنی چاہیے کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' ''بس چلتے جاؤ!'' موراکس (Morakis) تمہارے آگے چلا۔ وہ کمر دوہری کیے خرگوش کی مانند دوڑ رہا تھا۔ مگر تمہیں اپنا سانس بحال کرنے کے لیے درمیان میں اِدھر اُدھر رُکنا پڑتا، کتے اور تمہارے درمیان فاصلہ کم ہوتا گیا اور بالآخر کتے نے تمہیں دیکھ لیا، بھونک کی آواز، اور پھر وہ مسلسل بھونکتا چلا گیا۔ غلاظت اور کیچڑ میں لت پت اور ہانپتے ہوئے تم سڑک تک پہنچے۔ اب ایتھنز تک پہنچنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

☆☆☆

دل نواز دلؔ

غربتِ شامِ دشتِ تنہائی

(ڈاکٹر محمد امین کی شعری کتاب ''شامِ دشتِ تنہائی'' پر ایک تحریر)

دُنیا کی اتنی ساری رونقوں اور رنگینیوں کے باوجود، تنہائی کا بے کراں دشت حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے اور دل کی دھڑکنوں اور آنکھوں کی بصارتوں پر صبح و شام کے شفق رنگ سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ہے آج کے نہایت ترقی یافتہ اور حواس باختہ آدمی کی زندگی کا لُولُو منظر نامہ! اِس منظر نامے میں جہاں آج دھنک رنگ میں بھیگ سکتے ہیں وہاں آپ سیاہ اور سفید رنگوں کے تسلسل اور تضاد میں سوکھ بھی سکتے ہیں۔ اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے دَور میں آدمی کی تفریحِ طبع کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں مشغلے ایجاد کیے جا چکے ہیں۔ جیسے ٹی وی، ریڈیو، سینما، کمپیوٹر، روبوٹ، راکٹ، میزائل، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ وغیرہ جن کی مزید کئی کئی شکلیں ہیں اور ہر ایک شکل میں کئی کئی اور صورتیں ہیں جن سے دل بہلانے کے بے انداز سامان ہر طرح کے ساز کے ساتھ مہیا کیے گئے ہیں۔ آدمی دن رات اِن سے لطف اندوز ہونے کے جنون میں مجنون ہوتا جا رہا ہے اور لیلیٰ سکون و راحت ہے کہ بے قراری کے محمل میں بیٹھی بگولے کی ناقہ پر سوار، تنہائی کے بے چین دشت کی بے کرانی کی بے سمت شام کی جانب بھاگی جا رہی ہے۔

شاعر صدیوں تک فطرت اور قدرت کو دریافت کرتے رہے۔ پھر کہیں جا کر بساطِ زَن پر حرفوں اور لفظوں کے مہروں کے ساتھ کھیلنے کی باری آئی۔ یہ بساط تب بھی بچھی ہوئی تھی اور آج بھی کھلی ہوئی ہے اور آئندہ بھی اِس کے لپیٹے جانے کے امکانات دُور دُور تک نظر نہیں آتے کہ بقول اقبال:

وجود زَن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دَروں

بزم میں جہاں عورت نے شمع کی صورت جل کر زندگی کی بساط کئی بار اُلٹ دی وہاں رزم میں بارہا بھڑک کر ملک کے ملک جلا کر خاکستر کر دیئے اور یوں یہ دنیائے فانی کے نثری و شعری ادب کا سرمایہ قرار پائی۔ اس کے ساتھ ساتھ زَر اور زمین بھی شاعری کا موضوع ٹھہرے۔ یوں زر، زن اور زمین کی تکون نے دنیا کے چاروں کونوں میں تہلکہ مچا دیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زن یعنی عورت پہلے وفا، حیا اور شرم کا پیکر بن کر شعروں اور ادب پاروں میں خندہ زن ہوئی، اب اس کی برہنگی، عریانی، بے حیائی اور بے وفائی کا رونا لفظ لفظ اور حرف حرف میں کھلے بندوں رویا جا رہا ہے۔

شاعری میں نرگسیت کا عنصر عہدِ عتیق سے شامل ہے اور جب تک دریاؤں کی روانی شیشہ بنتی رہے گی یہ عنصر موجود و مطلوب رہے گا۔ زندگی کہ آب و حشت اور دہشت کا روپ دھار چکی ہے، دنیا کے روزمرہ میں دَر آئی ہے۔ اس عمل نے زندگی کو جہاں نہایت بدصورت کر دیا ہے وہاں موت کے فعل کو

بدشکل بھی بنا دیا ہے۔ آدمی کی کوئی قدر رہی ہے اور نہ ہی کوئی قیمت اور یوں شاعری کی بے قدری میں بے قیمتی نے اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ ادب ہر طرح سے بے مایہ اور بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے اور کتاب ورق ورق ہو کر کوچۂ ملامت میں بکھر کر رہ گئی ہے۔ زندگی اب صفحہ صفحہ موت کی وہ الف لیلیٰ ہے جس کی کوئی صبح ہے اور نہ شام۔ یہ وہ داستان ہے جس کی رات کے نصیب میں اب دن کی صورت نہیں۔

شاعری میں منافقت، ترحمی، تعلّی، انا پرستی اور خود ستائشی جیسی علّتیں پہلے کوئی کم نہ تھیں لیکن آج یہ اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی زیادتی سے زندگی کا توازن اور اعتدال درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کا شاعر ذاتی طور پر ادب اور شعر کی کم ترین سطح پر اُتر آیا ہے۔ اُس کا علم سطحی اور اُس کا عمل سفلی ہے اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اس قبیح فعل پر بے حد نازاں ہے۔ جن شاعروں کا نام ہونا چاہیے جو کہ معدودے چند ہیں، اُن کا نشان تک نہیں ملتا اور جن کا نشان ہے وہ ہر طرح اور طور سے شاعری کے نیک نام پر سیاہ دھبہ ہیں اور یوں اس کو ہر وقت اور ہر جگہ بدنام کرنے کے دَر پے ہیں کُرسی کو کوسنے والے شاعر کُرسی کے جائز و ناجائز حصول کی خاطر اور طلب میں کسی اچھے کام اور کام کا شعر کہنے کے قابل نہیں رہے اور یوں شاعری قلم، میزاور میزان کے جھول میں دب کر رہ گئی ہے۔

ایسے بے ادب عہد اور سخن سوز دَور میں ''شامِ دشتِ تنہائی'' جیسی شعری کتاب کا بازارِ مصر میں چھپ کر منصّۂ شہود پر آنا، دیدۂ زلیخا کے لیے دیدِ یوسف سے کسی طرح کم نہیں کہ یہ دیدِ شعر کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کو اَٹّی کی صورت میں کات کر اِن کے گھیر کا کسی نہ کسی حد تک ازالہ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ یعنی یہ دید، گھیر میں پڑے گنجل کو ضرور کھل کر دکھائے گی۔ ڈاکٹر محمد امین کو میں برسوں سے جانتا ہوں۔ شروع شروع میں یہ نظر کو عام سا لگنے والا شخص دھیرے دھیرے دل میں ایک خاص فرد کی صورت گھر کر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ نظر نے جو سرسری طور پر دیکھا وہ دیدۂ دل تک آتے آتے دیدنی ہو گیا۔

ڈاکٹر محمد امین نے ہائیکو کے حوالے سے مجھے خاصا متاثر کیا۔ جس کا اثر میری مشہور و معروف "TrilogyPlusOne" (ہائیکو پر میری چار کتابیں) تکونا سورج، تکونا چاند، تکونی زمین اور تکونے تارے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی کئی شعری اور نثری کتابیں پڑھی ہیں۔ اُن سے ملاقات اور بات نے مجھے اُن کی ذہانت اور فطانت کا قائل کیا اور یوں اُن کے خلوص سے بھری باتوں نے مجھے دل کی آواز سننے پر مائل کیا۔ ''شامِ دشتِ تنہائی'' حمد سے شروع ہو کر رباعیات پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں شامل پانچ نعتوں نے میرے گمان کو حقیقت میں بدل دیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آدمی واقعی دنیائے فانی میں ہر طرح سے تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ اُس کا اپنے رب اور رسول کو آج دائرہ دَر دائرہ، مرکز اور محور بنانا ایک ایسی بُرہان ہے جس کی اب کسی طور سے قطع و بُرید ممکن نہیں اور یہ آج کے شاعر کے لیے لمحۂ فکریہ ہے لمحۂ موجود کا میں یہاں ذکر نہیں کروں گا کہ لمحہ بہ لمحہ اگر ایک ہی فکر لگی رہے تو موجود کا جدا سے کیا ذکر۔ یقیناً جب فکر اور ذکر ایک ہوئے ہوں گے تو انہوں نے اُس لمحے ڈاکٹر محمد امین سے مندرجہ ذیل شعر کہلوایا ہو گا

زمانہ ایک لمہ ہے ابد کا
جو تابع ہے فقط رب احد کا

اِس سہولت سے کل زمانے کو ایک رب کے تابع کر دینا کتنا اَنیک اور کس قدر مشکل ہوتا ہے یہ وہی جانتا ہے جس نے زمانے کی ہونی اور اَن ہونی کے روپ میں دنیا جہاں کی نافرمانی دیکھی ہو۔ میں نے آدمی کی موجودہ بے سکونی اور بے اطمینانی کا جو دعویٰ مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے۔ اُس کی تسکین اور تشفّی کے ثبوت میں ڈاکٹر امین کی نعتوں سے چند چنیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

وہ نطق ہے کہ نطق الٰہی کہیں جسے
تسکینِ قلب و روح خطابت ہے آپؐ کی

یہ مفروضہ کہ حضورؐ ایک چلتا پھرتا قرآن تھے اور ہیں! حقیقت نہیں تو کیا ہے!! اس حقیقت کا اظہار جن الفاظ میں کیا گیا ہے وہ بولتے ہی نہیں زمین و آسمان کو برابر تولتے بھی ہیں۔

یہ شعور و آگہی کا آخری پیغام ہے
رہنمائی کے لیے اب اُن کی سنت دیکھئے

قرآن کے علم و حکمت پر عمل کر کے جو سنت ہماری نبیؐ نے قائم کی وہی تمام عالم کے لیے رہنما ٹھہرے گی۔ اس بات کا ادراک ہی عین ایمان ہے اور اس کی طرف بُلا، اور اس پر ثابت قدم رہنا ایک مومن کی پہچان

جب بھی ہجوم یاس نے گھیرا دل حزیں
بس نعتِ مصطفیٰؐ نے مجھے حوصلہ دیا

آج کا شور و شر کہ ہجوم یاس کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے لیے محمد مصطفیٰؐ کی یاد یعنی نعت ہی مایوس اور غم زدہ دل کے لیے ایک حوصلہ اور کوئی اُمید ہو سکتی ہے یہ وقت کی اہم ضرورت ہے جس کی طرف نعت گو نے کھلا اشارہ کیا ہے۔ اس اشارے کو سمجھنے اور سمجھانے کی جتنی آج ضرورت ہے شاید پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ اِس دورِ ابتلا میں ہر کوئی مبتلائے بلا ہے۔ یہ بلا اپنے لیے آدمی خود ہے اور اس نے اپنے آپ کو خود اس بلا میں مبتلا کر رکھا ہے۔ نفس کی حکمرانی نے اُسے ہوس، حرص اور ہوا کا غلام بنا دیا ہے۔ جس میں اب دم لینا اُس کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ خدا کی خوش نودی کے بغیر مادّی ترقی روح کو بھٹکا دیتی ہے اور یوں بندے کے لیے منزلِ مراد کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ اب بھی وقت ہے کہ آدمِ خاکی اپنے حقیقی مالک کی طرف لوٹ جائے اور یوں تمام کی تمام دنیاوی بلاؤں سے چھٹکارا پالے۔ بصورتِ دیگر جینا سدا کے لیے ایک عذاب بن کر رہ جائے گا اور جان اس عذاب کا رزق ہو کر رہ جائے گی جو زندہ درگور ہونے کے برابر ہے اور قبروں کو برابر ہونے یعنی خاک ہونے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے۔

''شامِ دشتِ تنہائی'' میں غزلوں کی ایک کہکشاں ہے جس کو تارہ تارہ گننا کسی ایک شبِ تنہائی کے بس کی بات نہیں چونکہ یہ بات دنوں پر پھیلی ہوئی ہے اس لیے اس کا سمیٹنا، اس کا حساب کرنا شاید کسی ورق ورق قاری کے لیے ممکن نہ ہو کہ ہر قاری کا ایک کتابی چہرہ کہاں!! ہاں غبارِ انجم میں اگر کوئی ایسا

ماہِ کامل سا شعر نظر آ جائے تو اُسے دیدہ و دل میں رکھنے کو جی چاہتا ہے

ہمارا رختِ سفر تھا غبار کی صورت
ہم اپنی عمر تری راہ میں گنوا آئے

یا پھر

مسافرت تھی وہ کیسی، وہ کیسی ہجرت تھی
یہ کیا ہوا کہ ترے پاس بھی نہ ہم ٹھہرے

مسافرت یعنی سفر اور ہجرت مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کرتے ہوئے امینؔ خود سے سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں کہ اے دوست، اے ہم دم، ہم مسافرانِ ازل سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہم تیرے پاس ایک پل ہی ٹھہر پاتے۔ یعنی مسلسل سفر اور تبدیلیٔ جگہ کا ابدی نوحہ زندگی بھر جاری و ساری رہتا ہے اور یہ آج کی دنیا کا سب سے بڑا اور بھرپور المیہ ہے۔ ''شامِ دشتِ تنہائی'' کہ زندگی کا اب یہی منظر نامہ ٹھہرا ہے۔ اس کی غربت یعنی انسان کی مادّی محتاجی اور روحانی مفلسی، اس نو دولتیے دَور کا بھیانک ترین صدمہ اور سانحہ ہے۔ جب یہ نوحہ راگ عراق میں الاپا جاتا ہے تو یہ سقوطِ بغداد کے غریب سُروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بنیادی سُر اُس وقت پنچم اور دَھوَت ہوتے ہیں جن پر وقت کے آمر جمہوریت کی بنیاد رکھنے کے لیے دنیائے فانی کو یُگل بندی کی دعوت دینے نکل پڑتے ہیں۔

''شامِ دشتِ تنہائی'' میں ایسے اور بھی کئی اشعار ہیں جن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور پھر نظمیں، نثری شاعری اور رباعیات اس پر مستزاد ہیں۔ جیسے نظمیں ''آدم سے مکالمہ''، ''مجھے تنہائی کا جنگل بلاتا ہے''، ''خود نوشت'' وغیرہ وغیرہ لیکن کوئی کہاں تک لکھے! کیوں نہ آپ کے پڑھنے کے لیے بھی کچھ چھوڑ دیا جائے! آپ بے شک کچھ نہ لکھئے لیکن ''شامِ دشتِ تنہائی'' میں جو لکھا ہے اُسے پڑھئے ضرور کہ اس سے آپ کی رات تاروں بھری اور صبح ضرور پُر نور اور پُر بہار ہو جائے گی۔

امین نے ''شامِ دشتِ تنہائی'' میں صرف دو ہائیکو شامل کر کے اس کو پُر درد اور پُر سوز بنا دیا ہے۔ کم از کم میرا یہی خیال ہے۔ پھر سوچتا ہوں کہ شاید ''شامِ دشتِ تنہائی'' میں موجِ ریگِ رواں کا یہی تقاضا جو ہو۔ کچھ بھی ہو مجھے اس کمی میں امین کی دانستہ زیادتی کا عمل دخل نظر آتا ہے جو دل پر گراں گزرا ہے بہر حال جو حال ہے وہ ظاہر ہے اور جو ظاہر ہے اس سے باطن کا پردہ کیا۔ ویسے بھی وہ دل ہی کیا جو درد کی گرانی کا خوگر نہ ہو یعنی اسے ارزاں نہ کر دے۔

آخر میں تتمہ بالخیر کے طور پر میرا ایک ہائیکو پڑھتے جائیے کہ یہ ''شامِ دشتِ تنہائی'' کا، میری نظر میں کل حاصل ہے

بے کرانی ہے بحر کی دل میں
کوہِ آتش فشاں لہو اندر
اس سے باہر ہے جو بھی لاوا ہے

☆☆☆

غزلیات

ڈاکٹر خیال امروہوی

سب کچھ خیال و وہم تھا قصے تمام خواب تھے
بھید وہ سارے کھل گئے جو بھی پسِ حجاب تھے

کیا کچھ نہ شرحِ غم ہوئی دشتِ بلا میں بیٹھ کر
شب کو وفور کرب تھا دن میں کئی عذاب تھے

اب کیوں شکستہ رُو ہوئے ناکامیوں کی دُھول سے
عیسیٰ نفس تمہیں تو تھے لاکھوں کا انتخاب تھے

جن کی چمک سے بڑھ گئی صحرا زدوں کی تشنگی
وہ تو نرا فریب تھے دریا نُما سراب تھے

وہ بھی تو ایک دَور تھا عزم جواں کا شور تھا
لفظوں کی تھی وہ گرم رَو نقطے بھی التہاب تھے

شاید گلوں کو یاد ہوں فصلِ طرب کی ناگہتیں
ہر سو صبا کا راج تھا سایہ فگن سحاب تھے

بڑھتے گئے قدم قدم گھوما کیے نگر نگر
صدہا کیے تجربے اچھے تھے یا خراب تھے

اب کے وہ سانحے ہوئے دھرتی ملی لہو لہو
پہلے تو یہ چلن نہ تھے ایسے کہاں عتاب تھے

کیوں نہ مرے وجود میں ڈھلتی ازل کی روشنی
دل میں مرے حسینؑ تھے ذہن میں بوترابؑ تھے

ڈاکٹر خیال امروہوی

زمیں پہ کچھ بھی نہ تھا جن کا وہ خدا بھی بنے
جو اپنے وقت کے حاتم تھے بے نوا بھی بنے

کثیر آیتیں اُتریں دفاع غربت میں
ہزار باغ امیدوں کے دلکشا بھی بنے

نشاطِ وصف کا غازہ بھی ہم سجا دیں گے
وہ کج مزاج کسی طور خوش ادا بھی بنے

طلب کی حد میں کسی وقت بھی کمی نہ ہوئی
اگرچہ آہنی قانون جا بجا بھی بنے

نہ جانے سحر ہوا اُن پہ کس کے درشن سے
جو بے خودی میں سرافیل کی صدا بھی بنے

کچھ اس طرح کے بھی مخلوق نے مرض بخشے
بہ چشمِ حکمت و تشخیص لا دوا بھی بنے

کسی نے ان کی خبر تک نہ دی کہاں گم ہیں
جو راہِ حق و صداقت میں ہمنوا بھی بنے

زوالِ ذات کی وحشت سے گر نجات ملے
تو موئے خامہ سے تصویر ارتقا بھی بنے

غرض پسند دعاؤں میں اُس سے کیا مانگوں
نئی لگن ہو تو کچھ طرزِ التجا بھی بنے

خاور اعجاز

رات کی دہلیز سے دن کی تھکن واپس ہوئی
شام جب آئی تو سورج کی کرن واپس ہوئی

حرف مٹی ہو گئے جب میری ہر تحریر کے
تب کہیں جا کر مجھے تقدیسِ فن واپس ہوئی

لفظ کے پاؤں میں اَن دیکھی سی اک زنجیر تھی
جب مجھے آزادیٔ شعر و سخن واپس ہوئی

پھول کو جب شاخ کی تنقید کا کانٹا لگا
شاخ کو خوشبو کے بدلے میں چبھن واپس ہوئی

اس سے آگے ساتھ چلنے کی اسے ہمت نہ تھی
منزلِ جاں سے مسافر کی تھکن واپس ہوئی

کتنے بوجھل تھے مری شامِ غریباں کے قدم
کتنی رُک رُک کر مری صبحِ وطن واپس ہوئی

خاور اعجاز

یوں مرے ہمراہ تیرے غم کا ہالا جائے گا
زندگی کے ساتھ عرصے تک اُجالا جائے گا

راستہ تبدیل کر لو گے اچانک ایک دن
دل مگر آہستہ آہستہ سنبھالا جائے گا

کھینچ لے گا ایک جذبِ اندروں مرکز کی سمت
اس زمیں کا آسمانوں تک حوالہ جائے گا

ہم چراغِ آرزو کو تو بجھا دیں گے مگر
قریۂ دل سے دھواں کیسے نکالا جائے گا

میری دانائی تو پل بھر میں بھلا دی جائے گی
ایک لغزش کو مگر برسوں اُچھالا جائے گا

خاور اعجاز

یونہی نہیں مرے ماتھے پہ اک عبارت سی
لہو میں تیر رہی ہے کوئی بشارت سی

اک اور عقدہ ہویدا ہوا پسِ عقدہ
یہ کائنات نظر آتی ہے بجھارت سی

ہوائیں بھیگ رہی ہیں شجر کی بانہوں میں
وصال رُت ہے کہ جذبات کی تجارت سی

گرا جو دل کا ستوں تب پتہ چلا ہم کو
اِسی سہارے کھڑی تھی کوئی عمارت سی

نئی صدی کے بدن میں فقط چمک ہو گی
سنبھال رکھنا دلوں میں کوئی حرارت سی

خاور اعجاز

ہماری ذات میں کیسے زوال آنے لگے
اَنا کے خول میں ہم لوگ سر چھپانے لگے

فصیلِ شہر پہ جو لوگ فتح مند گئے
وہی شکست کی افواہ بھی اُڑانے لگے

ابھی تو اپنے تشخص کی جنگ جاری تھی
ابھی سے لوگ کہاں آئنے چھپانے لگے

یہ کیسی فکر کا آسیب ہے خیالوں پر
ہم اپنے ذہن دریچوں سے خوف کھانے لگے

جنہیں کمالِ معانی عطا کیا ہم نے
وہ حرف چہرے بدل کر ہمیں ڈرانے لگے

کوئی تو سوچ مسافت میں ہم خیال ملے
جہاں ہمارا یہ بارِ سفر ٹھکانے لگے

بُلا لیا تھا ذرا دیر بعد ہی اُس نے
پلٹ کے جانے میں ہم کو مگر زمانے لگے

ہمی پہ ساعتِ فتحِ مبیں اُترنا تھی
ہمی اُحد کی پہاڑی کو چھوڑ جانے لگے

فراتِ وقت سے اک لمحۂ بقا دے کر
مرے حریف مرا ظرف آزمانے لگے

ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسے جانثار ہیں جو
چراغ بجھتے ہی خیمے سے لوٹ جانے لگے

پرویز ساحرؔ

قطرہ قطرہ زہر پینا آ گیا تھا
مجھ کو جینے کا قرینہ آ گیا تھا

اِس لیے بھی آتے آتے رہ گیا مَیں
راستے میں اِک مدینہ آ گیا تھا

درمیانِ گفتگو میری زباں پر
بس یونہی ذکرِ حسینہ آ گیا تھا

اِس سے پہلے مَیں قدم آگے بڑھاتا
مجھ تلک خود چل کے زینہ آ گیا تھا

بوسۂ خور میں وہ گرمی تھی کہ ساحرؔ
برف کو یک دَم پسینہ آ گیا تھا

پرویز ساحرؔ

عکس یا آئنہ حقیقت ہے
کون جانے کہ کیا حقیقت ہے

اور سب کچھ فریب ہے گویا
صرف ذاتِ خدا حقیقت ہے

تم جو کہتے ہو ''مَیں حقیقت ہوں''
اِس حقیقت کی کیا حقیقت ہے؟

یوں تو لاکھوں ہی قصے ہیں، لیکن
قصۂ کربلا حقیقت ہے

ظلم کی اندھی رات میں ساحرؔ
ایک جلتا دیا حقیقت ہے

ظفر اقبال نادؔر

بات کہنی ہے یہ خوش گفتار سے
آ گئے عاجز ترے انکار سے

جو تعلق تھا ہمارے درمیاں
مِٹ گیا ہے بے رُخی کے وار سے

جھوٹ کو سچ ماننا بھی موت ہے
خوف آئے کِس لیے پھر دار سے

جسم کیا یہ روح کو گھائل کریں
حرف مہلک ہوتے ہیں تلوار سے

اِس حویلی سے گریں گے جھونپڑے
کوئی کہہ دے بات یہ سردار سے

پھر دِکھا دے تیشۂ غم ، معجزہ
آنکالیں کوئی در دیوار سے

ہارنے کے بعد مر ہی جائے گا
جو گریزاں ہو ہمیشہ ہار سے

اے ظفؔر اپنی اَنا کو توڑ کر
چل کے ملتے ہیں پرانے یار سے

ظفر اقبال نادؔر

چاہتوں کا وہ اب سلسلہ کیوں نہیں
دل ترے نام پر چونکتا کیوں نہیں

یہ تو طے ہے کہ پتھر نہیں دوستو!
ہوں اگر آئینہ ، ٹوٹتا کیوں نہیں

دل ترا بھر گیا کیا مری ذات سے
جاؤں جو روٹھ کر ، روکتا کیوں نہیں

جو نہیں چاہا تھا وہ سبھی کچھ ملا
جو ابھی تک ہے چاہا ، مِلا کیوں نہیں

اپنے دل کا یہ عالم ہے اب تو ظفؔر
حادثہ کیوں نہیں ، سانحہ کیوں نہیں

نظمیں

خالد ریاض خالؔد

زرد چاند کا آخری دن

تھکن اوڑھ کر سوئے جسموں پہ
زنگ لگی کرنیں ناچتی ہیں
تو اپنے آپ سے بچھڑے ہوئے
مرجھائے چہرے جاگتے ہیں
گلیاں اور بازار، ہجوم لیے
گھومتی مٹی کی ڈھیری پہ پھرتے ہیں
رات گئے تک بھی
اپنی شناخت سے رہائی نہیں ملتی
دن ہماری مجبوریاں ڈھونے میں لگا رہتا ہے
شام اکیلی ہمارے انتظار میں رہتی ہے
ہوا زندہ ہے
اور دریا شہر میں اُتر آیا ہے
یہ کس نے صدا دی ہے
کہ میں اس کی آنکھوں میں
اب بھی نظر آتا ہوں
تھکن اوڑھ کر سوئے جسموں پہ
زرد چاند کا آخری دن
آخری بار ہنستا ہے
پھر نیلی چھت کے نیچے
کہیں کھو جاتا ہے

خالد ریاض خالؔد

سیلاب زدہ بستی

جانے وہ کہاں، میری تلاش کرتے رہے
ہواؤں میں، میری باس بھی تھی
میرے نقشِ قدم
راستوں کا زیور بھی تھے
نظروں میں رہنے والے درختوں کی
شاخوں سے، میری سانسیں لپٹی پڑی تھیں
بھیگے ہوئے پرندوں نے مجھے دیکھا تھا
منہ زور پانیوں نے
کہیں تو مجھے اُچھالا ہی تھا
جانے وہ کہاں، میری تلاش کرتے رہے
سیلاب زدہ بستی سے
پھر میں نے اپنا ملبوس
خود ہی ڈھونڈ نکالا تھا

ماورا احمد

''خواب اور خاک کے درمیان''

خواب اور خاک میں جانے یہ کیسا رشتہ ہے
وہ صبح جس کا سارا حسن
اک سنہرے روپہلے خواب میں تھا
وہ خواب جس کی دلآویزی نے
اس کا پور پور سنہرا کر دیا تھا
اس صبح کی شام عجیب والہانہ انداز میں
طلوع ہوئی
آنکھیں موتیوں سے بھر گئیں
پیروں سے لہو رِسنے لگا
روح تھکنے لگی
ہر طرف گرد ہی گرد اُڑنے لگی
اس شام کے بعد جو رات آئی
وہ کبھی ختم نہ ہوئی
چاروں اور دُھند نے ڈیرہ جما لیا
ہر طرف ایک ہی 'باس' رَچ گئی
مٹی کی باس!
جانے کیسا عجیب رشتہ ہے
خواب اور خاک کے درمیان
ہر خواب کا مقدر خاک ہونا
اس خاک کی مسند، چاند ستارے
خواب اور خاک۔۔۔۔۔
خاک اور خواب۔۔۔۔۔
میں اور تُو۔۔۔۔۔
تُو اور میں۔۔۔۔۔

حروفِ زر
(قارئین کے خطوط)

''انگارے'' کا فروری ۲۰۰۴ء کا شمارہ مل گیا ہے۔ جنوری کے شمارے میں ادارتی صفحے پر آپ کا یہ نوٹ بھی پڑھا کہ ''انگارے'' میں مسائل پر تو کھل کر بات کی جا سکے گی لیکن شخصیات زیر بحث نہیں آئیں گی۔ تاہم آپ نے ''شخصیات'' کی وضاحت نہیں کی کیوں کہ فروری کے پرچے میں سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' زیر بحث آیا تو اس میں سجاد ظہیر کو مورد تنقید و تنقیص بھی بنایا گیا اور انہیں ''فراری'' بھی شمار کیا گیا جو مصنف کی اپنی رائے تو ہو سکتی ہے لیکن سب اہلِ قلم ان سے متفق نہیں ہو سکتے۔ دوسرے ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر صاحب کا ایک خاص کردار تھا جسے اُنہوں نے نظریاتی راسخیت سے پورا کرنے کی کوشش کی، حتیٰ کہ جب انہیں پاکستان میں کمیونزم کے مشن پر بھیجا گیا تو وہ پارٹی کے حکم کی تعمیل میں اس نوزائیدہ ملک میں آئے اور زیر زمین رہ کر کام کرتے رہے اور راولپنڈی سازش کیس میں قید و بند کے آزار سے بھی گزرے۔ حال ہی میں معروف ترقی پسند ادیب احمد بشیر نے انکشاف کیا ہے کہ سجاد ظہیر کو پاکستان میں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ پاکستان کی آزادی کے برعکس دونوں ملکوں کو پھر متحد کرنے کے لیے کام کریں۔ اس کا جواب ماہنامہ ''نیا زمانہ'' میں حمید اختر صاحب نے دیا ہے اور احمد بشیر کی تردید کی ہے۔ یہ بحث ابھی تک چل رہی ہے اور تاریخ کی متعدد غلط فہمیوں یا غلطیوں کو نہ صرف رفع کر رہی ہے بلکہ شاید نئے سوالات بھی اُبھار رہی ہے۔ اس تمام بحث میں سجاد ظہیر مرکزی کردار ہیں، اس بحث سے سجاد ظہیر کا نام نکال دیا جائے تو بات آگے کیسے چلے گی اور قاری اپنا منصفانہ فیصلہ کس طرح کر سکے گا؟

یہ بات عرصہ ہوا طے پا چکی ہے کہ ادیب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ اوّلاً وہ کسی ملک کا ذمہ دار شہری ہے۔ اگر اس حیثیت میں تہذیبی اور اخلاقی تقاضوں کے خلاف کوئی حرکت کرتا ہے تو وہ قابل گرفت ہے۔ اس کی دوسری حیثیت ایک ادیب کی ہے اور اس حیثیت میں وہ ادب کے پیمانوں پر ہی پرکھا جائے گا جیسا کہ سجاد ظہیر کو محمد سلیم الرحمٰن صاحب نے پرکھا ہے۔ تاہم اس پرکھ میں ''ادب'' کی مخصوص میزان ہی استعمال کی جائے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ادب بھی ہوا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنا تمام خام مواد حالات و واقعات اور گرد و پیش ہی سے لیتا ہے اور اس کا تاثر کبھی بلا واسطہ طور پر اور کبھی بالواسطہ طور پر تخلیق میں آجاتا ہے چنانچہ کسی مصنف کو اس کی تخلیق سے غیر حاضر شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ ادب تو شخصیت کا پردہ ہے پھر بے نقاب بھی کرتا ہے۔

افسانہ یا نظم ہزار مشاہدے اور تجربے کا حاصل ہو لیکن تخلیق کار اس کے بطون میں موجود ہوتا ہے اور نفسیاتی تنقید ان آثار سے ہی مصنف / تخلیق کار کی ذہنی افتاد اور فطرت دریافت کرتی ہے۔ واحد متکلم میں لکھے گئے افسانے تو بالعموم مصنف کی آپ بیتی یا خود تجرباتی تصور کر لیے جاتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی ہے

لیکن اس سے مفر نہیں۔ میرا خیال ہے کہ نیک نامی کو قائم رکھنے کے لیے ہر ادیب کو قربانی دینی اور مثال قائم کرنی ناگزیر ہے۔ ادیب اپنے معاشرے کا ممتاز فرد اور کئی پڑھنے والوں کا آئیڈیل ہوتا ہے۔ اگر وہ اخلاق کے مروّجہ معیار سے گر جائے تو سارا معاشرہ منہدم ہو جاتا ہے۔ ادبی پرچے کا ایک اہم ترین مشن یہ بھی ہے کہ وہ معاشرے کو انہدام سے بچائے اور ادیبوں کی شخصی خامیوں، نقائص، بدعنوانیوں اور بدکاریوں کو منظرِ عام پر لائے تاکہ معاشرہ اس سے سبق حاصل کر سکے اور ادیب بھی اپنی اصلاح خود کر سکے۔ اب اگر کسی خام کار، منافق و مخرب اخلاق ادیب کو نامزد ہی نہیں کریں گے تو وہ تو اپنا الّو سیدھا کرتا رہے گا اور معاشرہ مسلسل داغ دار ہوتا چلا جائے گا۔ البتہ جس کو الزام علیہ قرار دیا جائے اسے اپنی وضاحت کا حق ضرور ملنا چاہیے اور یہی معاشرے کا صحت مند عمل ہے۔

میں یہاں اپنی ایک مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرے کرم فرما جمیل یوسف صاحب نے میری کتاب ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' کے خلاف ایک زہریلا مضمون اجمل نیازی صاحب کو اخبار ''پاکستان'' میں بھیجا، جس میں ذاتی حملے میرے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پر بھی کیے گئے۔ اجمل نیازی نے پروفیسر صابر لودھی کے حوالے سے دریافت کرایا کہ اگر انور سدید چاہے تو یہ مضمون اشاعت سے روکا جا سکتا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ یہ مضمون من وعن چھاپیے لیکن مجھے دفاع کا حق ضرور دیجیے۔ میں ڈاکٹر اجمل نیازی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے جمیل یوسف صاحب کا مضمون چھاپنے کے بعد میرا بیانِ دفاع بھی شائع کیا۔ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ میں اگر جمیل یوسف کا مضمون اجمل نیازی سے تعلقات کی بنا پر رکوا لیتا تو یہ ادبی اور سماجی اخلاقیات کے خلاف ہوتا اور جمیل یوسف کی پھیلائی ہوئی آلودگی میرے نام کے ساتھ چسپاں ہو جاتی۔

محترم جناب احمد ندیم قاسمی اُردو ادب کی مشہور ترین شخصیت ہیں، لیکن وہ خامیوں اور غلطیوں سے مبرّا نہیں۔ اگر ان کے کسی اور اقدام سے نئی نسل گمراہ ہوتی تو یہ غلطی ان کے نام منسوب ہونی چاہیے اور انہیں اس کی وضاحت کا حق ملنا چاہیے۔ وہ خود وضاحت نہ کر سکیں تو ان کے سینکڑوں مرید موجود ہیں، وہ حقِ عقیدت ادا کریں لیکن اگر حقیقت سامنے نہ لائی گئی اور بروقت وضاحت نہ کی گئی تو داغ ان پر موجود رہے گا اور تاریخ میں کبھی نہ کبھی ابھر کر ضرور سامنے آ جائے گا۔ اس وقت سے ہر ادیب کو ڈرنے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ میری کوئی غلطی یا خامی دیکھیں تو بروقت شائع کریں لیکن مجھے وضاحت کا حق بھی دیجیے۔ ازراہِ کرم یہ مکتوب ''انگارے'' کے ذہین قارئین کے سامنے پیش کر کے اس پر استصواب کرا لیجیے۔ آخری بات یہ کہ مجھے میری خامی یا غلطی سے آگاہ کرنے والا میرا دشمن یا بدخواہ نہیں بلکہ میرا دوست ہے اور میں اس کی وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، صابر لودھی، سجاد نقوی اور عامر سہیل سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

انگارے نمبر ۱۴ میں ابنِ حسن کا خط شائع ہوا ہے۔ اس خط میں ان کا مجموعی رویہ استرداد کا ہے۔ وہ پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ مسترد کرنا ہے۔ سیاق و سباق سے ہٹ کر گفتگو کرتے ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کو حتمی اور مطلق سمجھتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ۔ حالانکہ یہ خود ایک گمراہی ہے۔ صحیح علمی رویہ دوسروں کی گفتگو کو پوری توجہ سے سننا یا ان کی تحریر کا بغور مطالعہ کرنا ہے اور مدلل اور متوازن انداز میں اختلافِ رائے کرنا ہے۔ جبکہ ابنِ حسن انتہا پسندانہ اور متعصّبانہ انداز میں اختلافِ رائے کرتے ہیں اور دوسروں کو ضعف ذہنی کا شکار قرار دیتے ہیں حالانکہ خود ان کی تحریروں سے ان کے نفسیاتی کمپلیکس میں مبتلا ہونے کی گواہی ملتی ہے۔ کوئی ذہنی طور پر متوازن آدمی دوسروں کے خیالات کو یک قلم مسترد نہیں کرتا اور اپنے کہے کو حرفِ آخر قرار دینے کی جسارت نہیں کرتا۔

ابنِ حسن نے ناصر عباس نیر کے مقالے ''جدیدیت'' کی مخالفت میں ''انگارے'' کے آٹھ صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ ان کے سارے اعتراضات ان کی تنگ نظری اور ناصر عباس نیر کے مقالے کے بنیادی نکات کی عدم تفہیم کا نتیجہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ابنِ حسن مقالہ کی مشکل باتوں کی تفہیم کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ اصل بات شاید یہ ہے کہ وہ ناصر عباس نیر اور دیگر اہم نقادوں کی پگڑی اُچھال کر اپنے اہم ہونے کا بھونڈا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے گذشتہ ایک شمارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی تنقید کے بخیے اُدھیڑے ہیں۔ اس کا جواب تو ڈاکٹر انور سدید نے اپنے خط میں دے دیا ہے کہ انہیں وہ خاص قسم کے مضامین لکھ کر نئی مثال اور نظیر قائم کرنی چاہیے جس طرح کے مضامین کو وہ اعلیٰ تنقید سمجھتے ہیں۔

ابنِ حسن کو احساس ہے کہ ناصر عباس نیر نے اپنے مقالات سے قارئین کے وسیع حلقے میں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت ''انگارے'' کے تازہ شمارے میں پرویز ساحر کا خط ہے۔ میں اُن کی رائے درج کرنا چاہوں گا۔

> ''ناصر عباس نیر کا مبسوط تحقیقی اور تنقیدی مقالہ بہت پسند آیا۔ اس مقالے میں وہ تنقید کے نئے زاویوں کی طرف اشارہ نما ہیں۔ ان کے مقالوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خالصتاً ادبی زبان کو استعمال میں لاتے ہیں۔ ہم انہیں موجودہ عہد کے چند اہم تنقید نگاروں اور محققین میں شمار کر سکتے ہیں۔''

پرویز ساحر نے یہ رائے ناصر عباس نیر کے مقالے ''جدیدیت'' پر ہی دی ہے اور اسی مقالے کو ابنِ حسن نہ صرف مسترد کر رہے ہیں بلکہ ناصر عباس نیر کے طرزِ فکر کو ضعف ذہنی قرار دے رہے ہیں۔ ابنِ حسن نے پہلا اعتراض ناصر عباس نیر کی دی گئی کتابیات پر کیا ہے کہ ان میں لغات، انسائیکلو پیڈیا اور کچھ دانشوروں کی کتابیں جو بارہویں چودھویں کے طلباء کو ابتدائی معلومات پہنچانے کے لیے ہوتی ہیں۔ ابنِ حسن معلوم نہیں پیشے کے اعتبار سے کیا ہیں۔ اگر ان کا تعلق تدریس سے ہے تو پھر انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ بارہویں اور چودھویں تو کیا ایم۔اے کی سطح پر بھی اس قسم کے لغات اور انسائیکلو پیڈیا اور دیگر کتابیں نہ

پڑھی جاتی ہیں نہ پڑھائی جاتی ہیں۔ میں اٹھائیس برس سے بارہویں سے سولہویں جماعت تک کے طلباء اور طالبات کو پڑھا رہا ہوں۔ مجھے تو ایسے طالب علم آج تک نہیں ملے جنہیں میں نطشے کی کتاب Thus spoke the Zarusthara پڑھنے کی ترغیب دے سکوں۔ علاوہ ازیں ناصر عباس نیر کے مقالے کا سب سے اہم حصہ کتابیات بہرحال نہیں ہے۔ اہم حصہ تو خود مقالہ اور اس کے مندرجات ہیں۔ کتابوں کی مرعوب کن فہرست دنیا کون سا مشکل کام ہے؟ ابنِ حسن نے چونکہ طے کر رکھا ہے کہ وہ ہر حال میں اور ہر زاویے سے ناصر عباس نیر کو مسترد کریں گے۔ اس لیے وہ اعتراض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آگے چل کر انہوں نے لکھا ہے کہ جدیدیت ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے اور اس کا موازنہ کلاسیکی ادیبوں سے نہیں بنتا۔ یہ رائے پڑھ کر میں نے ابنِ حسن کی قوت تفہیم سے خوب لطف اُٹھایا ہے۔ وہ مخالفت واسترداد کے جنون میں یہ دیکھ ہی نہیں سکے کہ ناصر عباس نیر کے مقالے میں جدیدیت کا کلاسیکی ادیبوں سے موازنہ نہیں کیا گیا بلکہ جدید عہد کے کلاسیکی شعراء اور ادباء کا ذکر ہوا ہے۔ ناصر عباس نیر نے واضح طور پر لکھا ہے ''اگر ہم جدید عہد (نشاۃ ثانیہ) کی ادبی فکر پر نظر ڈالیں تو یہ فکر ان عناصر کی حامل نہیں دکھائی دیتی جنہیں آج جدیدیت سے منسوب کیا جاتا ہے۔'' انہوں نے جدید عہد کے کلاسیکی تخلیق کاروں کی انفرادیت کا ذکر ضرور کیا ہے اور انفرادیت جدیدیت کا ایک عنصر ہے۔ اب ابنِ حسن کو یہ سمجھانے کی بھی شاید ضرورت ہو کہ جدید عہد اور جدیدیت مترادف نہیں ہیں۔ جدید عہد کا آغاز بقول ناصر عباس نیر سولہویں صدی سے اور جدیدیت انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور بیسویں صدی میں فروغ پذیر ہوئی۔

ابنِ حسن نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ ناصر عباس نیر کے مقالے میں جدیدیت کو ایک ادبی اصطلاح اور تحریک کے طور پر زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ لہٰذا اس مقالے سے اختلاف بھی اسی بنیاد پر کیا جانا چاہیے تھا۔ اگر ناصر عباس نیر جدیدیت کے بنیادی اور ضمنی مفاہیم واضح نہ کر سکتے تو انہیں معتوب ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ ابنِ حسن کو مارکسی فکر کے علاوہ ہر دوسری فکر ضعف ذہنی کا شکار نظر آتی ہے۔ وہ مارکسی نقطۂ نظر کو (جو مادیت پسند ہے) حتمی صداقت کا علمبردار سمجھتے ہیں جبکہ دیگر نظریات اور فلسفوں کو موضوعی اور عینیت پسندانہ قرار دیتے ہیں۔ انہیں اس فلسفے کے تحت اپنے نظریات وضع کرنے کا اختیار ہے مگر کیا ضروری ہے کہ ان کے فلسفیانہ نقطہ نظر سے متصادم ہر نقطۂ نظر کو معرضِ اظہار میں لانے کی اجازت بھی نہ ہو۔ اگر ابنِ حسن اس روش پر گامزن رہے تو مارکسیوں کے بارے میں یہ رائے ایک بار پھر قائم ہو جائے گی کہ ان کے ہاں عدم رواداری، بنیاد پرستانہ تنگ نظری اور شدت پسندی ہوتی ہے۔ موجودہ فکری فضا مکالمے اور ڈائیلاگ کی ہے۔ ان کے علم میں ہوگا کہ نو مارکسیت کے اہم علمبردار الیتھوسے، ماشرے، ٹیری ایگلٹن، فریڈرک جیمس وغیرہ نے مارکسیت کی جو نئی تعبیرات کی ہیں ان میں انہوں نے ساختیاتی مطالعاتی طرز سے استفادہ کیا ہے اور یوں اس فاصلے کو کم کیا ہے جو کسی زمانے میں جدیدیت اور مارکسی ترقی پسندی میں تھا۔ ہر علم مکالمے اور اخذ وقبول کے نتیجے میں ترقی کرتا ہے مگر ابنِ حسن شاید عالمی سطح پر ہونے والی علمی اور

فکری پیش رفت سے کوئی آگاہی نہیں رکھتے۔ عالمی سطح پر اب Interdisciplinary رویہ فروغ پذیر ہوا ہے۔ اردو کے ترقی پسندوں میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کو اس امر کا پورا احساس ہے۔ ابنِ حسن نے ان کے تازہ مضامین ضرور پڑھے ہوں گے۔

ابنِ حسن جوشِ استرداد میں یہ بھی نہیں دیکھ سکے کہ ناصر عباس نیر نے جدیدیت کو معروضی انداز میں واضح کیا ہے۔ وہ جدیدیت کے پُر جوش مبلغ کے طور پر اس مقالے میں سامنے نہیں آئے۔ جبکہ ابنِ حسن نے انہیں جدیدیت کا پُر جوش حامی سمجھ کر اپنے دلائل کی نوک سناں پر رکھا ہے۔ ابنِ حسن کے علم میں ہونا چاہیے کہ ناصر عباس نیر نے ۲۰ ویں صدی کے تمام اہم تنقیدی نظریات پر پوری شرح و بسط سے لکھا ہے۔ انہوں نے جدیدیت کے علاوہ مارکسیت اور مابعد جدیدیت اور اس کے تحت آنے والی تھیوریز جیسے نئی تاریخیت، نسائی تنقید اور مابعد جدید مفکرین جیسے دریدا اور فوکو پر مفصل لکھا ہے۔ مکالمہ شمارہ نمبر ۸ میں ناصر عباس نیر کا ''مارکسی تنقید کے تین دور'' کے نام سے مقالہ چھپا ہے۔ ابنِ حسن کو وہ ضرور پڑھنا چاہیے اور پھر فیصلہ کریں کہ ناصر عباس نیر اپنے مقالات میں علمی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہیں یا نہیں۔ میری یہ پختہ رائے ہے کہ نئے نقادوں میں جو فکری گہرائی، تجزیہ کی غیر معمولی صلاحیت اور مسائل و سوالات کو ان کے درست تناظر میں رکھ کر سمجھنے کی جو اہلیت خدا نے اس نوجوان کو عطا کی ہے وہ ان کی نسل کے کسی دوسرے نقاد کے ہاں نظر نہیں آتی۔ ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ نئی نسل میں ایک اچھے نقاد کا اضافہ ہوا ہے۔ ابنِ حسن کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں کتنے تبصرہ نگار پیدا ہوئے ہیں اور کتنے باقاعدہ نقاد۔

ابنِ حسن کس طرح بات کو سیاق وسباق سے الگ کر کے نشانہ تنقید بناتے ہیں، اس کی کئی مثالیں ان کے اس خط میں موجود ہیں۔ مثلاً انہوں نے ناصر عباس نیر کے مقالے میں ڈاکٹر آغا افتخار حسین کی ایک سطر کو سیاق وسباق سے جدا کر کے اس پر خوب چاند ماری کی ہے۔ ناصر عباس نیر نے ڈاکٹر آغا افتخار حسین کا ایک پیراگراف درج کیا اور سیاق وسباق یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے جدیدیت کا سراغ ابتدائی تہذیب میں لگایا ہے۔ آغا صاحب کا حوالہ اسی ضمن میں ہے اور ظاہر ہے ایسا کرتے ہوئے انہوں نے جدیدیت کا وہ مفہوم پیش نظر رکھا جو ادب میں عام طور پر مروج ہوا ہے۔ جدیدیت کے مفہوم میں اس قدر لچک کے پیدا ہونے کے ایک سبب کی نشان دہی ناصر عباس نیر نے کی ہے۔ جس طرف ابنِ حسن کی نگاہ نہیں گئی۔ ناصر عباس نیر نے لکھا ہے کہ جدیدیت ۲۰ ویں صدی میں حاوی ڈسکورس ثابت ہوئی تھی۔ ابنِ حسن سے گزارش ہے کہ وہ ڈسکورس کی شدھ بدھ حاصل کریں۔ اگر مناسب سمجھیں تو ''استفادہ''، دہلی کے نئے شمارے میں ناصر عباس نیر کے مقالے ''مشل فوکو کے نظریات'' کا مطالعہ کریں۔ اس میں ڈسکورس کی خاصی وضاحت موجود ہے۔

ابنِ حسن کی سوچ کی سوئی فقط اس بات پر اٹکی ہوئی ہے کہ جدیدیت ایک فلسفیانہ اصطلاح

ہے اور کوئی آدمی ابنِ حسن کے علاوہ فلسفے کو نہیں جانتا۔ انہیں کون سمجھائے کہ تنقید فلسفہ نہیں ہے۔ تنقید میں فلسفیانہ عنصر ہوسکتا ہے۔ جس طرح بہت سے تخلیق کاروں کے ہاں فلسفیانہ عناصر ہوتے ہیں۔ جیسے غالب کے ہاں اور قرۃ العین حیدر کے ہاں فلسفیانہ عناصر موجود ہیں۔ تنقید کی جہت بنیادی طور پر فلسفے سے مختلف ہے۔ لہٰذا نقاد سے ایک باضابطہ فلسفی ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر ابنِ حسن کی بات مان لی جائے تو پھر نہ حالی نقاد ہیں نہ فراق نہ حسن عسکری نہ کلیم الدین نہ وزیر آغا، نہ شمس الرحمٰن فاروقی اور نہ گوپی چند نارنگ۔ صرف ابنِ حسن نقاد ہے کیونکہ وہ فلسفے کو ان سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ تاہم ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ناصر عباس نیر نے جدیدیت کو فلسفے کی ذیل میں بھی رکھا ہے۔ انہوں نے جدیدیت کا رشتہ ہیومن ازم کے فلسفے سے جوڑا ہے اور ہیومن ازم کے اہم نکات کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ نیز انہوں نے جدیدیت کو ایک جگہ فلسفہ بھی لکھا ہے اور اس کے تین عناصر عقلیت، داخلیت اور خودمختاریت کی نشان دہی کی ہے۔ مگر ابنِ حسن کو یہ سب اسی لیے قابلِ قبول نہیں کہ جدیدیت ان کی نظر میں ایک موضوعی عینیت ہے اور ضعف ذہنی کی مثال ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ کسی تنقیدی نظریے یا اصطلاح کو معرضِ تجزیہ لانا ضعف ذہنی ہے یا متعصّبانہ انداز میں کسی کے خیالات کو پورا پڑھے بغیر یک قلم ردّ کرڈالنا ضعف ذہنی ہے۔

ابنِ حسن کو رائی کا پہاڑ بنانے میں ملکہ حاصل ہے۔ وہ کسی مقالے پر اتنی ہی ضخامت کا خط لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ایسی خصوصی عینک ہے کہ انہیں مخالفت کرنے کے لیے اپنے مطلب کے چند جملے فوراً نظر آجاتے ہیں اور وہ پورا مقالہ پڑھنے کی زحمت سے بچ جاتے ہیں اور اس رائی سے وہ پہاڑ بنالیتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے انہیں کوئی خاص مسرت ملتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو ناصر عباس نیر سے گزارش ہے کہ وہ ''انگارے'' کے ہر شمارے میں اپنا کوئی مضمون ضرور بھجوادیا کریں تاکہ ابنِ حسن کو رائی کا پہاڑ بنانے کی مسرت ہر ماہ ملتی رہے۔ ویسے ناصر عباس نیر کے مقالات اوراق، استعارہ، شعروحکمت، مباحثہ، مکالمہ، بادبان، ادبیات، نظیر اور دیگر رسائل میں باقاعدگی سے چھپتے ہیں۔ وہاں بھی ابنِ حسن طبع آزمائی کرسکتے ہیں۔

(شفیع ہمدم۔ جھنگ)

''انگارے'' کا ایک سال پورا ہونے پر مبارک باد، میں دسمبر اور جنوری کے شمارے بھی پڑھ چکا ہوں۔ بس خط نہ لکھ سکا، فروری کا شمارہ میرے سامنے ہے ''چند باتیں'' آپ نے بہت اچھی اور سچی باتیں کی ہیں ان سب رویوں کو سنجیدگی سے دیکھنا ہوگا۔

مضامین میں محمد سلیم الرحمٰن کا ''لندن کی ایک رات'' اور ڈاکٹر عصمت جمیل کا ''کشور ناہید کی نظم بیداری نسواں سے بیداری انسان تک'' خوبصورت مضامین ہیں۔ ایسے مضامین کی اشاعت ہی ''انگارے'' کا خاصا ہے۔

''آؤٹ پوسٹ آف پروگرس'' اچھی کہانی ہے۔ ارشد ملتانی اور فہیم شناس کاظمی کی غزلیں قابلِ داد ہیں۔ ابنِ حسن اور ایم۔ خالد فیاض کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔

(خالد ریاض خالد۔ ملتان)

رسید اور اطلاع:

ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)، غلام حسین ساجد (لاہور)، ڈاکٹر عارف ثاقب (لاہور) قاضی عطاالرحمٰن (عارف والا)، ناصر حسین بخاری (اسلام آباد)، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، پرویز ساحر (ایبٹ آباد)، ڈاکٹر خیال امروہوی (لیہ)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، ناصر عباس نیر (جھنگ) ایم۔ خالد فیاض (گجرات)، ابنِ حسن (گوجرانوالہ)۔

☆☆☆